کتاب و سنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا علمبردار
ماہنامہ
اشرف الجرائد
حیدرآباد
Volume:15 Issue:6 June 2022
مدیر
مولانا محمد عبدالقوی
ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد
www.iauth.in

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

آئینۂ مضامین

اشرف الجرائد کی توسیع واشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ ادارہ

مسجد کی تخریب کاری: ایک سنگین جرم

از: مولانا سید خواجہ نصیر الدین قاسمی*

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

(سورۃ البقرہ: 114)

ترجمہ: اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں پر اس بات کی بندش لگادے کہ ان میں اللہ کا نام لیا جائے اور ان کو ویران کرنے کی کوشش کرے، ایسے لوگوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان (مسجدوں) میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے ایسے لوگوں کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور اُنہی کو آخرت میں زبردست عذاب ہوگا۔

توضیح: روئے زمین پر مساجد اللہ کے گھر ہیں، ان کی تعمیر حق تعالیٰ کی عبادت کے لئے ہوئی ہے، روزِ اول سے وہ اللہ کو نہایت محبوب ہیں، اور لوگوں کے لئے رُشد و ہدایت کا مرکز ہیں، وہاں بندگانِ خدا کتابُ اللہ کی تعلیم وتلاوت، اقامتِ صلوٰۃ، دعا و مناجات، اعتکاف وانابت جیسے اعمالِ خیر کے لئے حاضر ہوتے ہیں، اور سجدۂ نیاز بجالا کر اپنی عجز و بندگی کا اظہار کرتے ہیں اور دستِ دعا اُٹھا کر اپنی دنیا وآخرت کی بھلائیاں اس سے مانگتے ہیں اور بامراد زندگی گذارتے ہیں۔ اُن کے دل شرک وکفر کی نجاسات سے پاک ہوتے ہیں، عملی زندگی کی کوتاہیوں کا جو زنگ ان کے قلب پر لگ جاتا ہے اُسے بھی اعتراف قصور کر کے صاف کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اللہ کے گھر اسی کام کے لئے ہوتے ہیں، انھیں ایمان والے بندے ہی آباد رکھتے ہیں، وہ اپنے رب کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اِن کے بالمقابل بے ایمان، ابلیس کے پرستار، ناعاقبت اندیش، بدقسمت لوگ ہیں جو ان مساجد کو ڈھاتے ہیں، وہاں عبادتِ الٰہی سے بندگانِ خدا کو روکتے ہیں اور بالآخر کیفرِ کردار تک پہنچتے ہیں۔ ذکر کردہ آیت میں ایسے ہی لوگوں کو آگاہ کیا گیا کہ وہ دنیا وآخرت کی رسوائی مول لے رہے ہیں، پچھلی قوموں نے مساجد

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

کو ویران اور ختم کیا تو دونوں جہاں کی رسوائی ان کا مقدر بن گئی۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں: ''یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب یہ تینوں گروہ کسی نہ کسی زمانے میں اور کسی نہ کسی شکل میں اللہ تعالیٰ کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کے مرتکب ہوئے ہیں، مثلاً عیسائیوں نے شاہِ طیطوس کے زمانے میں بیت المقدس پر حملہ کر کے اُسے تاخت و تاراج کیا، ابرہہ نے جو عیسائی ہونے کا مدعی تھا بیت اللہ پر حملہ کر کے اُسے ویران کرنے کی کوشش کی، مشرکین مکہ مسلمانوں کو مسجد حرام میں نماز پڑھنے روکتے رہے اور یہودیوں نے بیت اللہ کے تقدس کا انکار کر کے عملاً لوگوں کو اس کی طرف رخ کرنے سے روکا، قرآن کریم فرماتا ہے کہ ایک طرف ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ تنہا وہی جنت کا حق دار ہے اور دوسری طرف ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت میں رکاوٹ ڈالنے یا عبادت گاہوں کو ویران کرنے کے درپے رہے ہیں، اسی آیت کا اگلا جملہ ذو معنی ہے اس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ حق تو یہ تھا کہ یہ لوگ اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا خوف لے کر داخل ہوتے نہ یہ کہ متکبرانہ انداز میں اُنہیں ویران کریں یا لوگوں کو وہاں اللہ کی عبادت سے روکیں؛ لیکن ساتھ ہی لطیف اشارہ بھی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب یہ متکبر لوگ جو اللہ کی مسجدوں سے لوگوں کو روک رہے ہیں حق پرستوں کے سامنے ایسے مغلوب ہوں گے کہ اُنہیں خود ان کی جگہوں پر ڈر ڈر کر داخل ہونا پڑے گا، چناں چہ فتحِ مکہ کے موقع پر کفارِ مکہ کے ساتھ یہی صورت پیش آئی۔ (توضیح القرآن)

مفسرین نے **وسعیٰ فی خرابھا** کی تفسیر میں فرمایا کہ جس طرح مساجد کو منہدم کرنا اس کی اصل ویرانی ہے اسی طرح ایسے اسباب اختیار کرنا جس سے مسجد کی آبادی خطرہ میں پڑ جائے لوگ مسجد کو آنا چھوڑ دیں یا کم ہو جائیں تو یہ بھی ویرانی مسجد میں داخل ہے۔ مسلمان اگرچہ کسی مسجد کو ڈھاتے نہیں لیکن ایسے اسباب سے دور رہنا چاہئے جس سے مسجد کے مصلی کم ہو جائیں، مثلاً مسجد میں شور و شغب کرنا، کھیل کود کرنے والے کم سن بچوں کو لانا، نوافل واذکار میں مشغول مصلیوں کے ہوتے ہوئے بلند آواز سے تلاوت کرنا یا بیان کرنا، یا سگریٹ تمباکو جیسی بدبودار چیزیں کھا کر مسجد آنا، مسجد کے راستوں میں ناچ گانا کرنا، یا مسجد کے راستے میں کوڑا کرکٹ ڈالنا یا گھروں سے نکلنے والے گندے پانی کو نہ روکنا وغیرہ۔

آیتِ مذکورہ میں کفار و مشرکین اور غافل مسلمانوں کو انتباہ ہے کہ وہ اگر اللہ کے گھروں کو ڈھانے اور وہاں عبادتوں میں خلل ڈالنے سے باز نہیں آئیں گے تو دنیا میں ذلیل و رسوا ہو کر رہیں گے اور آخرت کے سخت عذاب کا ان کو سامنا ہوگا۔

صلۂ رحمی وسعتِ رزق اور درازیٔ عمر کا سبب ہے

از: مولانا مفتی محمد احمد علی قاسمی*

عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَنْ أَحَبَّ أَنْ یُبْسَطَ لَہٗ فِیْ رِزْقِہٖ وَیُنْسَأَ لَہٗ فِیْ أَثَرِہٖ فَلْیَصِلْ رَحِمَہٗ (رواہ البخاری:۵۹۵۸)

ترجمہ: حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو چاہتا ہو کہ اُس کے رزق میں فراخی ہو اور اس کی عمر دراز ہو تو وہ صلۂ رحمی کیا کرے۔

تشریح: خاندان وقرابت اور رشتہ داری جہاں انسانوں میں باہمی تعارف وامتیاز کا ذریعہ ہے وہیں خوش گوار و پُرسکون زندگی کا وسیلہ بھی ہے؛ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں اِس بات کو اللہ تعالیٰ بہ طور احسان وانعام کے ذکر فرمایا؛ ارشاد ہے: اور وہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر اس کو نسبی اور سسرالی رشتے عطا کئے اور تمہارا پروردگار بڑی قدرت والا ہے۔ (الفرقان: ۵۴)

رشتے انسان خود نہیں بناتا؛ بل کہ اللہ پاک کے بنائے ہوئے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے اِن رشتوں کو برقرار رکھنا ہر مسلمان کے لئے لازم وضروری ہے توڑنا اور ختم کرنا حرام وگناہِ کبیرہ ہے، رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ہمدردانہ تعلقات قائم رکھنا ایک ایسا شرعی وربانی حکم ہے کہ اس میں انسان کو اجر وثواب کے ساتھ ساتھ دنیوی ومادی نفع بھی حاصل ہوتا ہے، ہر ذی عقل وہوش مند انسان کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ اُس کے رزق وروزی میں خوب برکت وفراخی ہو، اور عمر بھی دراز اور لمبی ہو، حدیثِ مذکور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذکر کردہ دونوں خوبیوں کو حاصل کرنے کا نہایت اہم اور آسان نسخہ بتلایا کہ ایسے شخص کو (جو روزی میں وسعت اور زندگی میں برکت کا خواہش مند ہے) صلہ رحمی (یعنی رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک) کرنا چاہیئے، علاوہ ازیں اسلام میں صلۂ رحمی کی بڑی اہمیت اور قطع رحمی سے سخت ممانعت ومذمت بیان کی گئی ہے، ارشادِ ربانی ہے:

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

’’اور رشتہ دار کو اس کا حق دو‘‘۔(سورۃ الاسراء:۲۶) یہ حکم قرآن مجید کی کئی آیات میں مذکور ہے۔

نیز ایک جگہ اپنے نیک بندوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا: اور جن رشتوں کو اللہ نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے، یہ لوگ اُنھیں جوڑے رکھتے ہیں (سورۃ الرعد:۲۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی بے شمار احادیث میں صلۂ رحمی کی اہمیت کو بیان فرمایا ہے، ایک دفعہ ارشاد فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا، اور جب اُس سے فارغ ہوئے تو رحم (رشتہ داری) نے عرض کیا: یہ اُس شخص کی جگہ ہے جو قطع رحمی سے تیری پناہ مانگے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ہاں! کیا تو اس پر راضی نہیں کہ میں اُسے جوڑے رکھوں جو تم سے اپنے آپ کو جوڑے رکھے، اور اسے توڑ دوں گا جو تم سے اپنے آپ کو توڑے؟ رحم نے کہا: کیوں نہیں اے پروردگار! اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: اگر تمہارا جی چاہے تو یہ آیت پڑھ لو: فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴿۲۲﴾ (سورۂ محمد) یعنی کوئی تعجب نہیں کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو تم ملک میں فساد برپا کروگے اور رشتے ناطے توڑ ڈالوگے۔(بخاری:۵۹۸۷) ایک حدیث میں صلۂ رحمی کی اصل حقیقت کو واضح کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کسی کام کا بدلہ دینا صلۂ رحمی نہیں ہے (یعنی جو صلہ رحمی کرنے والے رشتہ دار ہیں اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا صلہ رحمی نہیں ہے؛ بل کہ یہ مکافات یعنی بدلہ ہے) بل کہ اصل صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے جب اس کے ساتھ قطع رحمی (بدسلوکی) کا معاملہ کیا جائے تب بھی وہ صلہ رحمی کرے۔(بخاری:۵۹۹۱)

صلۂ رحمی کے تقاضوں میں یہ باتیں شامل ہیں؛ رشتہ دار اگر بیمار ہوں تو ان کی عیادت کرنا، خوشی ومسرت کا کوئی موقعہ ہو تو تہنیت وتبریک کا حق ادا کرنا، حادثہ اور صدمہ کا واقعہ ہو تو تعزیت وتسلی کا فرض نبھانا، غریب ہیں تو حتی المقدور مالی خدمت سے دریغ نہ کرنا، پریشان حال ہیں تو حتی الوسع پریشانی دور کرنے کے لئے کوشاں رہنا، جب تب ملاقات کے تقاضے پورے کرتے رہنا، قرض کی ضرورت ہو تو حسبِ استطاعت مدد کرنا یا کروانا، بہ ہر حال یہ اور اِس طرح کے مختلف تقاضے آئے دن ہر انسان کو پیش آتے رہتے ہیں؛ ایسے تمام مواقع پر اجنبی اور انجان بننے کے بجائے ہم دردانہ وخیر خواہانہ جذبات کے ساتھ اپنے رشتہ داروں کے لئے پیش پیش رہیں تو انشاءاللہ صلہ رحمی کے تقاضوں پر عمل کرنے والے ہوں گے، ایسی صورت میں اللہ پاک کی رحمتوں کے بھی مستحق ہوں گے اور حدیثِ مذکور کے مطابق دنیوی ثمرات وبرکات کے بھی لائق ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صلۂ رحمی کے تقاضوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

چند معروضات
ذمہ دارانِ مدارس کی خدمت میں

از: مدیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ وبہ نستعین

دو سال کے بعد الحمدللہ تعالیٰ مدارسِ دینیہ آزادی کے ساتھ حسبِ سابق کھل گئے ہیں، طلبہ کا بھی الحمدللہ رجوع ہے؛ لیکن گذشتہ دو سالوں میں طالب علموں کا جو نقصان ہوا وہ یقیناً ناقابلِ تلافی ہے، کتنے ہی طلبہ معاشی مصروفیات میں لگ گئے، کتنوں میں ذوقِ علم ہی ختم ہوگیا اور کتنوں کی عمر اور فراغت کا تناسب بدل گیا جو اگلے مراحل ومقاصد کو نقصان پہنچا گیا، جو کچھ بھی ہوا وہ کافی بڑا نقصان ہے مگر قضائے الٰہی سے پیش آیا ہے، بندوں کا اس میں کچھ دخل نہیں اس لئے حق تعالیٰ شانہ سے تلافیٔ مافات کی اُمید ہے۔

قصبات وقرایا میں معلوم ہو رہا ہے کہ ابھی تک مدرسوں کی صورتِ حال ابتر ہی ہے، سارا نظام مختل ہوگیا ہے، مشکل سے چند طلبہ فراہم ہو پا رہے ہیں، مدرسہ کی عمارت ہے؛ مسجد ہے؛ ضرورتوں کا انتظام ہے مگر طلبہ نہیں ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ ایسے مدارس کے نظماء بڑوں بزرگوں کے مشورے سے کسی ایک مدرسے کو مضبوط کریں تاکہ منظم انداز میں طلبہ کی تعلیم وتربیت ہوسکے، باقی مدارس کو ایک مرکز بنا کر اطراف واکناف میں مؤثر مکاتب کے قیام کی طرف توجہ دیں، چند طلبہ کے لئے تمام انتظامات اور اُن کے کثیر مصارف رکھنے کے بجائے بستی کے تمام اسکولی بچوں کے لئے تحفظِ دین وایمان کا سامان کرنا قوم کے سرمایۂ خلوص کا صحیح مصرف معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

مساجد کے خطباء محراب و منبر کے ذریعے علم دین کے حصول اور قرآن کریم کے حفظ کے فضائل بیان کر کے عوام الناس کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں تاکہ مسلمان اپنے بچوں کو علم دین میں مشغول کر سکیں، کیوں کہ اِن مدارس اور ان کی سرگرمیوں کا چلتے رہنا کتاب وسنت کی حفاظت واشاعت کا نہایت محفوظ وسیلہ ہے، اگر یہ کام سرد پڑ گیا یا برائے رسم رہ گیا تو ملتِ اسلامیہ کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچے گا اور دشمنانِ اسلام کے مقاصد پورے ہوں گے۔

جو مدارس ماشاء اللہ حسبِ حال بہ حال ہو گئے ہیں اور طلبہ بھی رجوع ہیں اُن مدارس کو حالاتِ زمانہ اور تقاضہائے وقت کو سمجھ کر نظام بنانا چاہیئے، رسمی وروایتی انداز سے کام چلانے کا رجحان اب کافی نہیں ہے، رابطۂ مدارس اسلامیہ دارالعلوم دیوبند کافی عرصے سے مدارس کو توجہ دلا رہا ہے کہ حکومت کی مداخلت پراپرٹی اور مالیے کی قانونی حیثیت کے حوالے سے ہوسکتی ہے، اس لئے مدارسِ اسلامیہ اِن دو چیزوں کو متعلقہ قوانین کی روشنی میں اطمینان بخش بنالیں تاکہ اچانک کسی پریشانی وبدنامی کا سبب نہ ہو، ٹرسٹ مضبوط ہو جن میں لائق واہل لوگوں کو شامل رکھا گیا ہو۔

اسی طرح تعلیمی نظام میں تبدیلی کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے، تمام دینی مدارس اپنے مقصد اور روح کو قائم رکھتے ہوئے مناسب حکمت ونظام کے ذریعہ طلبہ کی عصری تعلیم کا بندوبست بھی مدرسے میں کریں، کم ازکم دسویں جماعت تک ہر طالب علم کی رسائی کو یقینی بنائیں، اس کے لئے ابتداءً کچھ دشواریاں ضرور پیش آئیں گی مگر حالات کا مقابلہ کرنے اور اہداف کو حاصل کرنے کے لئے مشکلات سے گذرنا تو ایک لازمی امر ہے جس سے راہِ فرار اختیار نہیں کی جاسکتی۔

ایک بات حفظ کے مدارس سے بہت اہتمام سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قاعدے سے لے کر تکمیل حفظ تک طلبہ آپ کے پاس رہتے ہیں مگر اردو زبان پر کما حقہ قدرت حاصل نہیں کر پاتے، بالخصوص تحریر واملاء بہت ہی ناقص رہ جاتا ہے، جس سے اُنہیں آگے عالم کورس میں داخلہ اور تعلیم میں بہت تکلیف ہوتی ہے، اس لئے قرآن مجید کی تعلیم کے دوران ہی اردو لکھنے پڑھنے میں مہارت اور خوش نویسی کی عادت کو یقینی بنانے کی فکر بہت ضروری ہے۔

یہ چند سطریں نہایت مشاغل کے دوران ضروری سمجھ کر لکھ دیئے ہیں، حق تعالیٰ اپنے کرم سے نظامِ مدارس کو ہر قسم کی آفات اور آزمائشوں سے محفوظ ومامون رکھے۔ آمین و السلام علی النبی الکریم

گوشۂ سیرت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ کی امت کی خصوصیات

از: مرتب

حضرت وہب بن منبہؒ نے سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا اور بتایا کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے زبور میں ان پر یہ وحی اُتاری کہ:

اے داؤد! (علیہ السلام) عنقریب تمہارے بعد ایک نبی آئیں گے ان کا نام احمد، محمد، صادق اور سید ہوگا، میں کبھی ان سے ناراض نہیں ہوں گا، اور نہ وہ مجھ سے کبھی خفا ہوں گے، اس سے پہلے کہ وہ میری کوئی خلاف ورزی کرے میں نے اُن کی اگلی پچھلی سب خطاؤں کو معاف کر دیا، اور ان کی امتِ مرحومہ (کا حال یہ ہے کہ) میں نے اُسے وہ نوافل عطا کئے جو انبیاء کو عطا ہوتے ہیں، ان پر وہ فرائض لازم کئے جو انبیاء و رسل پر لازم کئے تھے یہاں تک کہ جب وہ قیامت میں میرے پاس آئیں گے تو اُنہیں ایسا نور ملے گا جیسا انبیاء کا نور ہوتا ہے، اس لئے کہ میں نے اُن پر ہر نماز کے لئے ایسی پاکی لازم کی ہے جیسے کہ ان سے پہلے پیغمبروں پر فرض کی، اُنہیں جنابت ہو جانے پر غسل کا حکم دیا جیسا کہ ان سے پہلے نبیوں کو دیا، اُنہیں حج کا حکم دیا جیسا کہ ان سے پہلے نبیوں کو دیا، اور میں نے اُن کو جہاد کا حکم دیا جیسا کہ اُن سے پہلے رسولوں کو دیا۔

اے داؤد! (علیہ السلام) میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اور ان کی امت کو تمام امتوں پر فضیلت بخشی ہے، میں نے ان کو ایسی چھے خوبیاں دیں جو میں نے کسی اور اُمت کو نہیں دیں:

۱) میں اُن کی خطا اور بھول پر پکڑ نہیں کروں گا۔

۲) جو گناہ انہوں نے بغیر قصد کے کر لیے اور پھر مجھ سے معافی مانگی تو میں اُنہیں بخش دوں گا۔

۳) جو کچھ اپنے اعمالِ خیر وہ آگے اپنی آخرت کے لئے بھیجیں گے میں اُنھیں بہت جلد کئی گنا بڑھا کر دوں گا۔

۴) میرے پاس ذخیرہ کئے ہوئے اعمال میں ان کے لئے کئی گنا اجر ہوگا بلکہ اس میں اضافہ

ہوتا رہے گا۔

۵) اگر وہ بلاؤں وباؤں میں مصیبتوں پر صبر کریں اور ان کی زبان پر انا للہ وانا الیہ راجعون رہے تو میں ان پر رحمت وبرکت اتاروں گا اور اُنہیں نعمتوں والی بہشت کی راہ نمائی کروں گا۔

٦) اگر وہ مجھ سے دعا کریں گے تو قبول کرلوں گا، یا تو وہ اس کی قبولیت فوراً دیکھ لیں گے، یا میں اس کے بدلے ان سے کوئی مصیبت ٹال دوں گا، یا اس دعا کو اُن کے لئے ذخیرۂ آخرت بنا دوں گا۔

اے داوٗد! (علیہ السلام) امتِ محمدیہ میں سے جو کوئی مجھ سے اس حال میں ملے کہ وہ گواہی دیتا ہو کہ تنہاء میرے سوا کوئی اور معبود نہیں، اور میرا کوئی شریک نہیں، اور دل سے اس کی تصدیق بھی کرتا ہو تو وہ میری جنت میں میرے ساتھ، میری اعزاز وکرام کے ساتھ رہے گا، اور جو کوئی مجھ سے ملے اس حال میں کہ اس نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جھٹلایا ہو اور ان کی شریعت کا انکار کیا ہو اور میری کتاب کا مذاق اُڑایا ہو تو میں اس کی قبر میں ہی سخت عذاب اُتاروں گا، اور قبروں سے اُٹھنے والے دن میں ملائکہ اس کے چہرے اور پشت پر ماریں گے، پھر اس کو جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ڈال دوں گا۔ (دلائل النبوۃ للبیہقی: ۱/۳۰۱)

فوائد: (۱) امتِ مسلمہ کے لئے یہ مقام شکر ہے کہ اللہ نے اُسے رفیع القدر اور عظیم الشان پیغمبر کی امت بننے کا شرف بخشا ہے، فللہ الحمد علی ہذہ المنۃ والکرم۔

(۲) زبور میں ذکر کردہ یہ وہ خصوصیات ہیں جس کی قرآن کریم کی کئی آیات تصدیق کرتی ہیں۔

(۳) ہر خوبی میں امتِ مسلمہ کے لئے بے انتہاء خیر چھپا ہوا ہے، امت کو نہ صرف یہ کہ ان باتوں پر ایمان لانا ہے بل کہ ان خصوصیات ومراعات سے بھرپور فائدہ اُٹھانا بھی ہے۔

(۴) غور کرنے کی بات ہے کہ بھول چوک کا ناقابل مواخذہ ہونا، توبہ واستغفار پر قبولیت کا وعدہ، طاعات پر غیر معمولی صلہ، مصائب میں صبر پر رحمتوں کا نزول، دعاؤں کی قبولیت۔ حق تعالیٰ شانہ کے ایسے عظیم انعامات ہیں جو بندوں کی دنیوی واُخروی حاجات پوری کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں۔ اس کے باوجود بھی امت ان اعمال میں مشغول نہ ہو تو رب کا تو کچھ نقصان نہ کرے گی اپنا ہی سب کچھ کھو بیٹھے گی۔

گوشہ خواتین

اسلام کی باکمال خواتین

حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا

از: مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی*

صفیہ بنت عبد المطلب، ہاشمی، بڑی جلیل القدر اور عظیم المرتبت صحابیہ ہیں، حضرت عبد المطلب کی ایک دوسری بیوی فاطمہ بنت عمرو کے بطن سے تھیں، اس رشتہ سے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی تھیں، اس لئے انہیں عمۃ النبی ﷺ کے خطاب سے ملقب کیا جاتا ہے، یہ حضرت حمزہ کی حقیقی بہن ہوتی ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دیگر پھوپھیاں جن میں ام حکیم، بیضاء، امیمہ، عاتکہ، برہ اور اروی کے قبول اسلام کے حوالے سے اہل سیر کا اختلاف ہے، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے قبول اسلام میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں، ابنِ اثیرؒ نے ''اسد الغابۃ'' میں لکھا ہے: ''والصحیح أنه لم یسلم غیرھا'' (اسد الغابۃ: صفیۃ بنت عبد المطلب: ۷/۱۷۱، دار الکتب العلمیۃ، بیروت) صحیح یہ ہے کہ ان کے علاوہ کسی نے دامن اسلام سے وابستگی اختیار نہیں کی، اگرچہ ابن سعد اور حافظ ابن قیم رحمہما اللہ نے ''عاتکہ'' اور ''اروی'' کو بھی خواتین اسلام میں شامل کیا ہے، لیکن حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ السابقون الاولون میں شمار ہوتی ہیں، دعوت اسلام کے آغاز وابتداء میں ہی انہوں نے قبولِ اسلام کی سعادت حاصل کرلی تھی، اور شرف اسلام سے بہرور ہوچکی تھیں، تقریباً نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم سن تھیں۔ (الطبقات الکبری لابن سعد: صفیۃ بنت عبد المطلب: ۸/ ۳۴، دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

ان سے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بھائی حارث بن حرب اموی نے نکاح فرمایا، جن سے ایک لڑکا تولد ہوا، پھر حارث انتقال فرما گئے، تو ان سے عوام بن خویلد قرشی الاسدی نے جو حضرت سیدہ خدیجہ بنت خویلد کے بھائی تھے، نکاح کیا تو ان سے تین لڑکے: زبیر، سائب اور عبد الکعبہ تولد ہوئے، یہی حضرت عوام کے فرزند حضرت زبیر بن عوام ہیں جو حواری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شمار ہوتے ہیں۔ والدہ کے قبول اسلام کے ساتھ ان کا سولہ سالہ فرزند زبیر بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔

* ادارہ علم وعرفان، حیدرآباد، واستاذ حدیث دار العلوم دیودرگ

فرزندارجمند کی تربیت

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے فرزندارجمند زبیر کی نہایت عمدہ اخلاق کے ساتھ پرورش کی، وہ چاہتی تھیں کہ ان کا فرزند ایک نڈر اور بہادر سپاہی بنے، جس کے لئے وہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے بہت مشقت والے کام کرواتیں، نہایت ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیتیں، مسلسل سرزنش اور زدوکوب سے کرتیں، ایک دفعہ چچا نے بھتیجے کو ماں کے ہاتھوں مار کھاتے دیکھا تو بے تاب ہوگئے، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو سخت ڈانٹ پلائی کہ اس طرح تو بچے کو مار ڈالوگی، بلکہ نوفل نے بنو ہاشم اور اپنے قبیلے کے بعض لوگوں سے شکایت بھی کی کہ صفیہ کو بچے پر اسقدر سختی سے روکیں، جب لوگوں میں ان کے تئیں بچوں کی تربیت کے حوالے سے اس قدر سختی اور سخت گیری کا چرچا ہوا تو یہ رجز پڑھنے لگیں:

من قال إني أبغضه فقد كذب، إنما أضربه لكي يلبّ ويهزم الجيش ويأتي السلب

جس نے یہ کہا کہ میں اس (زبیر رضی اللہ عنہ) سے بغض رکھتی ہوں اس نے غلط کہا، میں اس کو اس لئے مارتی ہوں کہ وہ عقلمند ہو۔ اور فوج کو شکست دے اور مال غنیمت حاصل کرے۔

(الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: الزبیر بن عوام: ۲/ ۴۵۸، دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

علامہ ابن حجرؒ نے ''الاصابہ'' میں تحریر کیا کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو لڑکپن میں ایک جوان آدمی کے ساتھ مقابلہ درپیش ہوگیا، انہوں نے ایسی ضرب لگائی کہ اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے شکایت کی گئی تو بجائے معذرت کے لوگوں سے دریافت کیا کہ ''تم نے زبیر کو کیسے پایا، بہادر کہ بزدل؟'' ''كيف رأيت زبيرا، أو قطا وتمرا؟ أم مشمعلا صقرا'' (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: الزبیر بن عوام: ۲/ ۴۵۸، دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

ماں کی تربیت کا اثر تھا کہ بڑے جری اور بہادر واقع ہوئے تھے، پیغمبر اسلام کی محبت رگ وپے میں رچ بس چکی تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لئے ہمہ تن تیار رہتے۔ سب سے پہلے اسلام کے لئے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے تلوار اٹھائی، بعثت کے ابتدائی دنوں میں یہ افواہ پھیلی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دشمنان اسلام گرفتار کرلیا ہے، یا شہید کردیا ہے، بے قرار ہوکر آستانہ نبوت پہنچیں صحیح سالم دیکھا تو جان میں جان آئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال دریافت کرنے پر فرمایا: کہ میری جان آپ پر قربان میں سنا کہ آپ کو مشرکین نے گرفتار کرلیا ہے؟ (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: الزبیر بن عوام: ۲/ ۴۵۹، دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

ہجرت مدینہ

نبی کریم ﷺ نے جب مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کی تو ان کے فرزند ارجمند حضرت زبیر ملک شام عازم تجارت تھے، دوران واپسی درمیان راہ حضرت نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی جو مکہ سے مدینہ عازم سفر ہجرت تھے، اس وقت حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ (اپنے خسر) کی خدمت میں چند سفید کپڑے بطور ہدیہ پیش کئے اور یہی وہ سفید کپڑے تھے جن کو زیب تن کر کے مدینہ میں داخل ہوئے، حضرت عروہ بن زبیرؓ سے بخاری میں اس سلسلہ کی روایت موجود ہے (بخاری، کتاب المناقب، باب ہجرۃ النبی ﷺ) فرزند کے مکہ واپسی کے فوراً بعد حضرت صفیہؓ نے اپنے فرزنداوران کی اہلیہ حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مدینہ کی طرف ہجرت کچھ مدت قباء میں قیام پذیر رہے، وہیں ۱ سنہ ھ میں اور ایک روایت کے مطابق ۲ ھ میں حضرت اسماءؓ کے بطن سے عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔

حضرت حمزہؓ کی شہادت اور صبر وضبط

غزوہ احد سن ۳ ہجری میں جب اتفاق سے جنگ کی صورتحال بدل گئی، اوراس کی اطلاع حضرت صفیہؓ کو ہوئی تو مدینہ سے ہاتھ میں نیزہ لئے نکلیں، راستے میں جنگ سے پیٹھ پھیر کر واپس آنے والوں کو غیرت دلاتی رہیں، جب میدانِ جنگ کی طرف ان کو نبی کریم ﷺ نے آتے دیکھا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ صفیہ رضی اللہ عنہا کو حضرت حمزہؓ کی لاش کے پاس جانے نہ دیں، حضرت حمزہؓ غزوہ احد میں مقتول ہوگئے، ان کی نعش کا مثلہ کیا گیا، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو جب فرزند نے اطلاع دی تو فرمایا: مجھے پتہ ہے، مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے بھائی کی لاش بگاڑ دی جائے، خدا کی قسم! مجھے یہ پسند نہیں، لیکن میں صبر کروں گی اور انشاء اللہ صبر سے کام لوں گی''۔ '' فقد بلغني أن مثل بأخي، فما أرضانا بما كان من ذلك، لأصبرن و لأحتسبن إن شاء الله'' (اسد الغابۃ: ۷/۱۷۱) اس کے بعد اجازت ملی تو بھائی کی نعش دیکھ کر آہِ سرد بھری، بادیدہ نم بھائی کے جسم کے ٹکڑے دیکھ کر ''انا للہ وإنا إليه راجعون'' پڑھا، مغفرت کی دعا کی اور دو چادریں بھائی کی تدفین کے لئے پیش کر کے مدینہ واپس ہوئیں ''أقبلت صفية بنت عبد المطلب و معها ثوبان تريد أن تكفن أخاها'' (الطبقات الکبری لابن سعد: حمزۃ بن عبد المطلب: ۳/۱۱)

ایک روایت میں ہے کہ حضرت صفیہؓ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکیں، بے اختیار رو پڑیں تو نبی کریم ﷺ

نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو صبر کو تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

’’مجھے جبرئیل امین نے خبر دی ہے کہ عرش معلیٰ پر حمزہ بن عبد الملطب کو اسد اللہ اور اسد الرسول (اللہ اور اس کے رسول کا شیر) لکھا گیا ہے‘‘۔

بلکہ علامہ ابن حجر ؒ نے ’’اصابہ‘‘ میں لکھا ہے کہ حضرت صفیہؓ نے حضرت حمزہ ؓ کی شہادت پر ایک پر درد مرثیہ کہا، جس کے ایک شعر میں رحمت عالم ﷺ کو یوں مخاطب کیا:

إن یوما أتی علیک لیوم　　　کوّرت شمسه و کان مضیئا

آج آپ پر وہ دن آیا ہے کہ آفتاب سیاہ ہو گیا ہے، حالانکہ اس سے پہلے وہ روشن تھا۔

(الاصابة فی تمیز الصحابة: صفیة بنت عبد المطلب: ۲۱۳/۸)

غزوہ خندق میں ان کی بہادری:

غزوہ خندق کے موقع جب ہر طرف کے دشمنوں نے مسلمانوں کا سرے سے خاتمہ کرنے کے لئے مدینہ کا محاصرہ کیا تھا، اس وقت مسلمان عورتوں کو قلعہ بنی حارثہ میں محفوظ کر دیا تھا، تاکہ انہیں کوئی گزند نہ پہنچے، قلعہ پر حفاظت کے لئے حسان بن ثابت جو ضعیف اور کمزور تھے مامور تھے، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ ایک یہودی نے یہ دیکھ کر مسلمان اِدھر پھنسے ہیں، قلعہ پر حملہ کا منصوبہ بنایا، وہ یہودی پھاٹک تک پہنچ چکا تھا کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی ماں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے جو رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی تھیں، آگے بڑھ کر اس کام تمام کر دیا اور اس کا سر کاٹ کر میدان میں پھینک دیا، یہ دیکھ کر بنو قریظہ سمجھے کہ قلعے میں بھی کچھ فوج ہے اس لئے ادھر ہمت نہی کی، اس وقت ان کی عمر اٹھاون برس کے لگ بھگ تھی (سیرت ابن ہشام: ۲۳۹/۳)

وفات اور تدفین

ان کی وفات سن ۲۰ ہجری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوئی، یہ بقیع میں مدفون ہوئیں جب کہ عمر ستر سال تھی اور جنت البقیع آسودہ خاک ہوئیں۔ ’’ولھا ثلاث و سبعون سنة، و دفنت بالبقیع‘ (اسد الغابة: صفیة بنت عبد المطلب: ۱۷۱/۷)

تذکارِ صحابہؓ

ابن عمِ الرسول ابوالمساکین سیدنا جعفر طیارؓ

مولانا عبدالرشید طلحہ نعمانی قاسمی*

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا شمار سابقین اولین کے مصداق اُن قدیم الاسلام صحابہؓ میں ہوتا ہے، جنہیں حبشہ اور مدینہ دونوں جانب ہجرت کا شرف حاصل ہوا، خاندانی شرافت ونجابت کے ساتھ ساتھ آپؓ فہم وفراست، فصاحت و بلاغت، بسالت وشجاعت، اور فیاضی وسخاوت جیسے اعلی ترین اوصاف کے حامل تھے، خوش الحانی وجادو بیانی، جرئت و بے باکی اور معاملہ فہمی وحاضر جوابی کا وہ عالم تھا کہ حضرت عمرو بن عاصؓ جیسی سیاسی بصیرت رکھنے والی شخصیات بھی حیران وشش درره جاتی تھیں، شاہ حبشہ نجاشی کے دربار میں آپ کی تقریرِ دل پذیر علم وادب کا شہ پارہ اور اسلام کا خلاصہ تصور کی جاتی ہے۔ جنگ موتہ میں اسلامی لشکر کے سپہ سالار تھے، اسی جنگ میں شہادت عظمی سے سرفراز ہوئے، لسان نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؓ کو ذوالجناح، طیار اور ابوالمساکین جیسے بلند پایہ القاب سے نوازا اور ایک موقع پر پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے ارشاد فرمایا: میں نہیں جانتا کہ مجھ کو جعفر کے (مدینہ طیبہ) آنے سے زیادہ خوشی ہوئی یا خیبر کی فتح سے؟۔ رضی اللہ تعالی عنہ

مختصر حالات زندگی:

حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کا تعلق قبیلۂ قریش کے مشہور ومعزز ترین خاندان ''بنو ہاشم'' سے تھا، آپ کی شکل وصورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت پائی جاتی تھی؛ یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپؓ کو مخاطب کر کے یوں فرمایا کرتے تھے: ''تم شکل وصورت اور اخلاق وعادات میں میرے مشابہ ہو''۔ (ترمذی، باب مناقب جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ)

حضرت جعفر طیارؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشفق ومہربان چچا خاندانِ بنو ہاشم کے سردار اور متولیٔ کعبہ یعنی جناب ابوطالب کے فرزند تھے، ابوطالب کے چار بیٹے تھے، طالب، عقیل، جعفر، اور علی۔ حضرت جعفرؓ، حضرت علیؓ سے دس سال بڑے تھے، ظہورِ اسلام کے وقت حضرت علیؓ دس سال کے تھے؛ جبکہ حضرت جعفرؓ کی عمر اُس وقت بیس سال تھی۔ مکہ میں شدید قحط کے زمانے میں رسالت ماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوطالب کی تنگ معاشی

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

کے سبب چچا عباسؓ سے کہا کہ ہمیں جناب ابوطالب کا بوجھ بانٹنا چاہیے اوران کے بیٹوں کو اپنے زیر کفالت لے لینا چاہیے، انہوں نے اس رائے کو پسند کیا، چناں چہ نبی پاک ﷺ نے حضرت علیؓ کا جبکہ حضرت عباسؓ نے جعفرؓ کا انتخاب کیا۔ حضرت جعفرؓ اور علیؓ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے اور باشعور ہونے تک بالترتیب حضرت عباسؓ اور رسول اللہ ﷺ کی زیر کفالت وتربیت رہے۔ (سیرت ابن ہشام)

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ جب بڑے ہوئے تو ان کا نکاح مشہور صحابیہ حضرت اسماء بنت عمیسؓ سے ہوا، اور اولاد بھی انہی سے ہوئی، جن میں محمد، عون اور عبداللہ شامل ہیں۔ قبولِ اسلام کے بعد تکالیف ومصائب کا دور شروع ہوا، ور جب مشرکینِ مکہ کی طرف سے ایذارسانیوں کا سلسلہ عروج کو پہونچا، تب نبوت کے پانچویں سال رسول اللہ ﷺ سے مشاورت کے بعد بہت سے مسلمان مکہ سے ملکِ حبشہ کی جانب ہجرت کر گئے، انہی مہاجرینِ حبشہ میں یہ دونوں میاں بیوی بھی شامل تھے۔ مشرکینِ مکہ کو جب ان مظلوم ومجبور مسلمانوں کی مکہ سے خفیہ روانگی اور پھر حبشہ پہنچنے کی خبر ملی تو انہیں یہ بات بہت ناگوار گذری اور انہوں نے طیش میں آکر اپنا ایک وفد حبشہ کی جانب روانہ کیا؛ تاکہ یہ وفد حبشہ پہنچ کر وہاں کے بادشاہ ''نجاشی'' سے ملاقات کرے، اور اسے مسلمانوں کے خلاف ورغلانے کے بعد اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ مہاجرین کو دوبارہ ان (مشرکینِ مکہ) کے حوالے کردے۔

آخر اس منصوبے کے تحت مشرکینِ مکہ کا ایک وفد ملکِ حبشہ جا پہنچا، اور بادشاہ کے پاس حاضری سے قبل اس کے درباریوں اور مشیروں سے متعدد ملاقاتیں کیں، ان کے ساتھ تعارف اور دوستی کے رشتے استوار کئے، اور پھر بطورِ رشوت قیمتی تحائف اور نذرانے بھی پیش کئے، یوں شاہی دربار میں پیش ہونے اور وہاں اپنی آمد کا مقصد بیان کرنے سے قبل ہی ان مکاروں اور شاطروں نے بادشاہ کے وزیروں اور مشیروں کو اپنی مٹھی میں کرلیا......!!

بعدازاں بادشاہ سے ملاقات کی اور اپنا مدعا پیش کیا، مشرکینِ مکہ اور اپنے زرخرید وزیروں کی گفتگو سننے کے بعد بادشاہ نے کہا: ''انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے ان مسلمانوں کی بات بھی سن لی جائے اور اس کے بعد ان کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر کیا جائے''۔ چنانچہ مسلمانوں کو وہاں دربار میں طلب کیا گیا، بادشاہ نے ان سے وضاحت طلب کی اور کہا: یہ کون سا دین ہے کہ جس کی خاطر تم نے اپنے آباواجداد کے دین کو چھوڑ دیا ہے؟

نجاشی کے دربار میں:

مسلمانوں نے نجاشی سے گفتگو کے لیے اپنی طرف سے سیدنا جعفرؓ کو ترجمان منتخب کیا اور انہوں نے اس

طرح اپنی تقریر کا آغاز کیا: ’’بادشاہ سلامت! ہماری قوم نہایت جاہل تھی، ہم بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو ستاتے تھے، طاقت ور کمزوروں پر ستم ڈھاتا تھا، غرض! ہم اسی بدبختی میں تھے کہ اللہ نے خود ہی ہماری جماعت میں سے ایک شخص کو ہمارے پاس رسول بنا کر بھیجا، ہم اس کی شرافت، راستی، دیانت داری اور پاک بازی سے اچھی طرح آگاہ تھے، اس نے ہم کو شرک و بت پرستی سے روک کر توحید کی دعوت دی، راست بازی، امانت داری، ہمسایہ اور رشتہ داروں سے محبت کا سبق سکھایا اور ہم سے کہا کہ ہم جھوٹ نہ بولیں، بے وجہ دنیا میں خونریزی نہ کریں، بدکاری اور فریب سے باز آئیں، یتیم کا مال نہ کھائیں، شریف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں، بت پرستی چھوڑ دیں، ایک اللہ پر ایمان لائیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوۃ دیں، چناں چہ ہم اس پر ایمان لائے اور اس کی تعلیم پر چلے، ہم نے بتوں کو پوجنا چھوڑا، صرف ایک خدا کی پرستش کی، اور حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھا، اس پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہوگئی، اس نے طرح طرح سے ظلم وتشدد کر کے ہم کو پھر بت پرستی اور جاہلیت کے برے کاموں میں مبتلا کرنا چاہا، یہاں تک کہ ہم لوگ ان کے ظلم وستم سے تنگ آ کر آپ کی حکومت میں چلے آئے‘‘۔

نجاشی نے کہا تمہارے نبی پر جو کتاب نازل ہوئی، اس کو کہیں سے پڑھ کر سناؤ، سیدنا جعفرؓ نے سورۃ مریم کی چند آیتیں تلاوت کیں تو نجاشی پر ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی، اس نے کہا اللہ کی قسم! یہ اور تورات ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں پھر قریش کے سفیروں سے مخاطب ہو کر کہا: واللہ! میں ان کو کبھی واپس نہ جانے دوں گا۔

سفرائے قریش نجاشی سے صریح انکار سننے کے باوجود نہ ٹلے۔ انہوں نے کہا، کل ہم بادشاہ سے ایسی بات کریں گے کہ مسلمانوں کی خوشیوں پر پانی پھر جائے گا۔ وہ پھر دربار میں پہنچ گئے اور کہا، یہ لوگ عیسیٰؑ بن مریم کے بارے میں بڑی غلط باتیں کرتے ہیں۔ نجاشی نے سیدنا جعفرؓ کو بلا کر اس باب میں اسلام کا نقطۂ نظر دریافت کیا، انھوں نے جواب دیا، عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں، اللہ نے کنواری مریمؑ کی طرف اسے القا کیا، اس عفیفہ کو کسی بشر نے چھوا تھا نہ پہلے اس کا کوئی بچہ ہوا تھا۔ نجاشی نے ایک تنکا اٹھایا اور کہا، جو تم نے عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقت بتائی، اس میں اس تنکے جتنا اضافہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر پادریوں نے ناک بھوں چڑھائی۔ نجاشی نے سیدنا جعفرؓ اور ان کے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا، جاؤ! میرے ملک میں اطمینان وسکون سے رہو۔ جو تمھیں برا بھلا کہے گا، سزا جھیلے گا۔ اس نے قریش کے دیے ہوئے تحائف واپس کرنے کا حکم دیا اور کہا، ہمیں ان کی چنداں حاجت نہیں۔ (مسند احمد)

اس کے بعد سیدنا جعفرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفر ہجرت (مدینہ) کے چھ سال بعد تک حبشہ ہی میں رہے

اور ۷ ھ میں حبشہ سے مدینہ آئے ، یہ وہ زمانہ تھا کہ خیبر فتح ہو گیا تھا اور مسلمان اس کی خوشی منا رہے تھے کہ دریں اثناء اپنے دور افتاد بھائیوں کہ واپسی سے ان کی خوشی دوہری ہوگئی ، سیدنا جعفرؓ سامنے آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو گلے سے لگایا اور پیشانی چوم کر فرمایا، میں نہیں جانتا کہ مجھ کو جعفر کے آنے سے زیادہ خوشی ہوئی یا خیبر کی فتح سے؟، پھر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جعفرؓ کو مسجد نبوی کے قریب ہی مکان کے لیے جگہ عنایت فرمائی اور اپنے قریب تر ان کی سکونت کا انتظام کیا۔ (طبقات ابن سعد)

حضرت جعفرؓ مدینے میں:

مذکورالصدر تفصیل سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیز مدینہ میں موجود دیگر مسلمانوں کے ساتھ حضرت جعفرؓ کی تقریباً پندرہ یا سولہ سال کی مسلسل اور طویل جدائی کے بعد ملاقات ہوئی تھی؛ یہی وجہ تھی کہ جس طرح حضرت جعفرؓ اور ان کے اہل وعیال اس ملاقات پر انتہائی شاداں وفرحاں تھے، اسی طرح خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر تمام مسلمان بھی اس موقع پر بہت مسرور تھے، بالخصوص مدینہ کے فقراء ومساکین حضرت جعفرؓ کی آمد سے بہت زیادہ خوش تھے، کیونکہ ان کی مدینہ آمد کے فوری بعد ہی سبھی نے ان کے اس مزاج کو جان لیا تھا کہ یہ تو بہت ہی سخی، فیاض، مہمان نواز اور مہربان قسم کے انسان ہیں، محتاجوں اور ضرورت مندوں کی مدد واعانت کے معاملے میں خوب دریا دلی سے کام لیا کرتے ہیں، چنانچہ ان کی اسی خوبی کی وجہ سے وہ ''ابوالمساکین'' یعنی ''غریب پرور'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ہم مساکین کے لیے تو جعفر بن ابی طالب بہت ہی اچھے انسان تھے، وہ ہمیں اپنے گھر لے جایا کرتے، جو کچھ کھانا میسر ہوتا وہ ہمیں کھلایا کرتے، یہاں تک کہ جب کھانا ختم ہو جاتا تو وہ چمڑے کی خالی تھیلی لا کر ہمارے حوالے کر دیا کرتے (جس میں گھی وغیرہ رکھا جاتا تھا)، ہم اس تھیلی کو پھاڑ دیا کرتے، اور تب اس کی دیواروں میں لگا ہوا گھی بھی ہم چاٹ لیتے تھے۔ (بخاری شریف)

یہ تھے وہ جذبات واحساسات اور یہ تھا وہ خوشی کا سماں جو حضرت جعفرؓ کے مدینہ تشریف لانے سے چہار سو دکھائی دے رہا تھا؛ لیکن یہ خوشی دیرپا نہ رہ سکی، خوشی کا سلسلہ بہت ہی مختصر ثابت ہوا، حضرت جعفرؓ کی حبشہ سے مدینہ آمد ۷ ھ میں ہوئی تھی، اس کے فوری بعد محض اگلے ہی سال ۸ ھ کے اوائل میں ''غزوۂ موتہ'' کا عجیب وغریب واقعہ پیش آ گیا۔ (ملخص از اصحاب الرسول:292)

غزوۂ موتہ اور واقعہ شہادت:

یہ سن آٹھ ہجری کی بات ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد مختلف ممالک کے حکم رانوں کو

دعوت اسلام کے خطوط لکھ رہے تھے، اس اثنا میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت کی سب سے بڑی عیسائی سلطنت روم کے باج گزار صوبہ شام کے ایک حکمران کے نام بھی خط روانہ کیا۔ خط لے کر جانے والے صحابی حضرت حارث بن عمیرؓ تھے جنہیں قیصر روم کے ایک ماتحت عرب سردار شرجیل بن عمرو نے شہید کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے سفیر کے قتل کا قصاص لینے کے لیے تین ہزار صحابہ کرامؓ پر مشتمل لشکر روانہ کیا جس کا کمانڈر حضرت زید بن حارثہؓ کو مقرر فرمایا جو کہ ایک آزاد کردہ غلام تھے۔ جبکہ لشکر میں حضرت خالد بن ولیدؓ اور بعض دیگر معروف جرنیل بھی شامل تھے؛ اس لیے عام عرب روایات کے مطابق زید بن حارثہؓ کی تقرری کو عجیب محسوس کیا گیا؛ مگر آپؐ نے لشکر کو انہی کی قیادت میں روانہ کر دیا اور ساتھ ہی یہ ہدایت فرمائی کہ زید بن حارثہؓ شہید ہوں تو ان کی جگہ عبداللہ بن رواحہؓ لشکر کے امیر ہوں گے اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالبؓ لشکر کی کمان سنبھالیں گے۔

تین ہزار صحابہؓ کا یہ لشکر جب شام کے علاقہ بلقاء میں پہنچا تو نہ صرف شرجیل بن عمرو ایک لاکھ فوج جمع کر کے اس کی کمان کرتے ہوئے مقابلہ کے لیے موجود تھا بلکہ خود قیصر روم بھی ایک لاکھ فوج کے ساتھ اسی علاقہ میں خیمہ زن تھا۔ یہ اس وقت کی سب سے بڑی عیسائی سلطنت اور دنیا کی سپر پاور روم کے ساتھ مسلمانوں کی پہلی معرکہ آرائی تھی۔ امیر لشکر زید بن حارثہؓ نے اپنی عددی قوت کو دشمن کے مقابلہ میں بہت کم سمجھتے ہوئے جنگ شروع کرنے سے قبل جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوبارہ رابطہ قائم کرنے کا خیال ظاہر کیا؛ مگر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور بعض دیگر حضرات نے اس سے اتفاق نہ کیا اور رائے دی کہ اب جب کہ ہم یہاں تک آ گئے ہیں تو پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بجائے مقابلہ میں ڈٹ جانا چاہیے۔ چنانچہ موتہ کے مقام پر تین ہزار کا یہ لشکر شرجیل بن عمرو کے ایک لاکھ کے لشکر کے مقابلہ میں جا کھڑا ہوا۔

غزوہ موتہ میں دو غیر متوازن طاقتوں کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی، تعداد اور اسلحہ کسی اعتبار سے کوئی مناسبت نہ تھی، حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ انہوں نے اتنے آبدار ہتھیاروں سے لیس زرق برق پوشاکوں میں ملبوس لشکر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، جنگ شروع ہوئی اور امیر لشکر حضرت زید بن حارثہؓ بے جگری سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کر گئے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ آگے بڑھے اور انہوں نے بھی کچھ دیر مقابلہ کے بعد شہادت کا مقام حاصل کر لیا۔ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے لشکر کی کمان سنبھالی اور مقابلہ پر ڈٹ گئے۔ پرچم ان کے دائیں ہاتھ میں تھا جس پر دشمن نے وار کیا اور وہ ہاتھ کٹ گیا، انہوں نے پرچم دوسرے ہاتھ میں لے لیا، اس پر ایک وار ہوا اور وہ بھی کٹ گیا، اب پرچم کو انہوں نے گردن میں دبا کر گرنے سے بچایا اور

پوری دلیری کے ساتھ کھڑے رہے، بالآخر شہید ہو گئے۔ اُس دور میں میدان جنگ میں پرچم کا گر جانا شکست کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

حضرت خالد بن ولیدؓ ایک سپاہی کی حیثیت سے لشکر میں موجود تھے اور جنگ میں شریک تھے۔ انہوں نے یہ منظر دیکھا تو جرات رندانہ سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھ کر پرچم تھام لیا اور لشکر سے مخاطب ہو کر اعلان کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقرر کردہ تینوں امیر باری باری شہید ہو گئے ہیں اب مشورہ کا وقت نہیں ہے اس لیے میں نے از خود آگے بڑھ کر کمان سنبھال لی ہے اور اب اس لشکر کی قیادت (خالد بن ولیدؓ) کر رہا ہوں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کے سامنے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے اس لشکر کو دشمن کے نرغے سے بحفاظت کس طرح نکالا جائے۔ اور اس وقت کی معروضی صورتحال میں کامیابی یہی تھی کہ لشکر کو کسی مزید نقصان کے بغیر جنگ سے باہر لے جایا جائے تا کہ صورتحال کا از سر نو جائزہ لے کر نئی حکمت عملی طے کی جا سکے۔ چنانچہ انہوں نے کمال حکمت عملی، حوصلہ مندی اور تدبر کے ساتھ اس لشکر کو دشمن کے نرغے سے نکالنے میں کامیابی حاصل کر لی؛ جس کے بعد نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں "سیف اللہ" کا خطاب دیا۔

امام بخاریؒ نے نافع کے واسطہ سے ابن عمرؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں نے جنگ موتہ کے روز حضرت جعفرؓ کے پاس جب کہ وہ شہید ہو چکے تھے کھڑے ہو کر ان کے جسم پر نیزے اور تلوار کے پچاس زخم شمار کئے، ان میں کوئی بھی زخم پیچھے نہیں لگا تھا، ایک دوسری روایت میں ابن عمرؓ کا یہ بیان اس طرح مروی ہے کہ میں بھی اس غزوہ میں مسلمانوں کے ساتھ تھا، ہم نے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کو تلاش کیا تو انھیں مقتولین میں پایا اور ان کے جسم میں نیزے اور تیر کے نوے سے زیادہ زخم تھے۔ مورخین کے مطابق شہادت کے وقت آپ کی عمر صرف اکتالیس سال تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حزن وملال:

جس وقت سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غمگین وحزین ہو گئے، بہ نفس نفیس حضرت جعفر کے گھر تشریف لائے، اشک بار آنکھوں کے ساتھ سانحے کی اطلاع دی اور صحابہ سے فرمایا: تم جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانے کا بندوبست کرو! ان کو مشغول کرنے والی چیز پہنچ چکی ہے۔ (ابن ماجہ)

ابن سعد کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جعفر بن ابو طالب کے گھر جانے میں تین دن کا توقف کیا، پھر ان کے گھر پہنچے تو فرمایا: آج کے بعد میرے بھائی پر مت رونا، پھر فرمایا، میرے بھتیجوں کو لے آؤ، وہ ابھی چھوٹے تھے، آپ نے انھیں پیار کیا، ساتھ چمٹایا اور نائی کو بلا کر ان کے بال منڈائے پھر فرمایا: محمد بن جعفر

ہمارے چچا ابو طالب سے مشابہت رکھتا ہے، اور عبداللہ بن جعفر کی جسمانی ساخت اور اس کے اخلاق مجھ سے ملتے جلتے ہیں، آپ ﷺ نے عبداللہ کا ہاتھ پکڑا، اسے بلند کیا اور تین بار دعا فرمائی، یا اللہ! تو جعفر کے اہل خانہ میں اس کا قائم مقام ہو جا، عبداللہ کے ہاتھوں میں برکت ڈال دے، آپ ﷺ نے سیدہ اسماء بنت عمیسؓ سے کہا، تو تنگ دستی سے ڈرتی ہے، میں دنیا و آخرت میں ان بچوں کا ولی اور ان کے باپ کی جگہ ہوں۔ (ابوداؤد)

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے چند روز بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رَایتُ جَعفَر اًیَطِیرُ فِی الجنۃِ مَعَ المَلاَئِکَۃِ (ترمذی) ''میں نے جعفر کو جنت میں فرشتوں کے ساتھ اُڑتے ہوئے دیکھا ہے'' چونکہ غزوۂ موتہ کے موقع پر یکے بعد دیگرے ان کے دونوں بازو کٹ کر جسم سے جدا ہو گئے تھے، لہٰذا ان کٹے ہوئے بازوؤں کے عوض اللہ نے انہیں جنت میں پر عطا فرمائے ہیں، جن کے ذریعے وہ وہاں فرشتوں کے ساتھ اُڑتے پھرتے ہیں۔ یہ منظر خواب میں رسول اللہ ﷺ کو دکھایا گیا، اسی وجہ سے وہ ''جعفر طیار'' کے لقب سے معروف ہوئے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ

(بقیہ صفحہ ۳۵ سے)

ہوتے ہوتے ۱۹۱۸ آ گیا اور اپنی توجہ کی باگ پہلے بدھ مذہب اور پھر ہندو فلسفے (خصوصاً تھیا سوفسٹ اسکول) کی طرف مڑ گئی۔ مسنر بسنٹ، آربندو گھوش، ڈاکٹر بھگوان داس، مہاراج تلک اور اینڈ منڈ ہومز، سال چھ مہینے کے مسلسل مطالعۂ روحانیت نے مادیت و الحاد کا طلسم توڑ کر رکھ دیا اور صاف نظر آنے لگا کہ ایک زبردست علم روح اور روحانیت کا بھی ہے۔ عین اسی زمانے میں شبلی کی سیرت النبی ﷺ جلد اول شائع ہوئی، جس نے پیغمبر اعظم ﷺ کی پیغمبری نہ سہی تاہم مصلحانہ عظمت و برتری کا پوری طرح قائل کر دیا۔ اس دور میں اتنا بھی بہت غنیمت تھا۔ اس کے معاً بعد خوش بختی سے رسائی مولانا روم کی بے مثل مثنوی تک ہو گئی۔ اس کے کان پوری ایڈیشن کے چھیوں ضخیم دفتروں کو اول سے آخر تک پڑھ ڈالا گو سمجھ میں بیش تر حصہ نہ آیا، پھر بھی اب کیا عرض کیا جائے کہ اس نے کیسی قلب ماہیت کر دی اور پڑھنے والے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور دل ابھی مثنوی کے مزے لے ہی رہا تھا کہ مولوی محمد علی لاہوری کا انگریزی تفسیر ترجمۃ القرآن ۱۹۲۰ میں میری نظر کے سامنے آ گیا اور جو کچھ کسر ("کسر" کا لفظ ہم نے اپنے قیاس سے لکھا ہے، کتاب میں یہاں پر جو لفظ درج ہے وہ مٹا ہوا ہے، کوشش بسیار کے باوجود بھی ہمیں سمجھ میں نہیں آیا، صدیقی) مسلمان ہونے میں باقی رہ گئی تھی وہ پوری ہو گئی۔ (ص: ۱۰۷۱۰۴)

اصلاحی مضامین

علم دین سے بے رغبتی؛ عصر حاضر کا المیہ

از قلم: مفتی احمد عبید اللہ یاسر قاسمی*

علم خواہ دینی ہو یا دنیوی انسان کو عالی مرتبت بناتا ہے، علم کی اہمیت وحی الٰہی کے آغاز سے مسلم ہے، علیم و حکیم پروردگار نے انبیاء و رسل کو علم کی شمع جلانے، نور ہدایت کو عام کرنے، اور جہالت کی ظلمت کو کافور کرنے کے لیے معلمین انسانیت بنا کر اس دنیا میں مبعوث فرمایا، علم کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: العلم نور و الجهل ظلمة (علم ایک نور اور جہالت ایک تاریکی ہے) علم ہی کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: العلم باق لا یزال (علم باقی رہنے والا ہے جو کبھی فنا اور ختم نہیں ہوگا) کیونکہ یہ انبیاء کی میراث ہے اور نبیوں کی دین ہے ارشاد گرامی ہے: إنَّ العلماءَ ورثةُ الأنبياءِ، وإنَّ الأنبياءَ لم يُوَرِّثوا دينارًا ولا درهما، إنما وَرَّثوا العلمَ، فمن أخذه أخذ بحظٍّ وافرٍ (رواہ أبوداود: 3641، والترمذی: 2682)

علم دین کی اہمیت و فضیلت مسلم ہے قرآن وحدیث کے صفحات علم دین کی فضیلت سے بھرے پڑے ہیں، علم جہاں نعمت خداوندی ہے وہیں رحمت ربانی بھی ہے، جہاں ذریعہ برکت ہے تو وہیں باعث نجات اور وجہِ سربلندی ہے، اصل علم تو علمِ دین ہے، یہی علمِ دین انسان کو گمراہی سے ہدایت تک پہنچاتا ہے، تاریکی کے قعرِ مذلت سے نکال کر نورِ ہدایت سے روشناس کراتا ہے، اسی علمِ دین سے وابستگی نے قومِ مسلم کو ہر محاذ پر کامیاب کیا، اسی علمِ دین سے رشتہ و تعلق نے مسلم اُمۃ کو عظیم مناصب اور کامیابی کی بلند منازل پر فائز کیا، اسی علمِ دین سے وابستگی کی بنیاد پر ساری دنیا میں تہذیبِ اسلامی کا سویرا تھا، اور علم وہ شئ ہے جسے نہ چرایا جاسکتا ہے، نہ چھینا جاسکتا ہے، نہ آگ میں علم کو جلایا جاسکتا ہے، نہ سمندر میں غرق کیا جاسکتا ہے۔

علمِ دین کے تئیں معاشرہ کی المناک صورت حال

ان سب فضائل کے باوجود بھی آج مسلم معاشرہ علمِ دین سے کوسوں دور ہے اور دن بہ دن دینی علوم سے دوری میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے، اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کہ ایک بچہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

کے باوجود صحیح کلمہ پڑھنا نہیں جانتا ہے، طہارت اور نماز کے ضروری مسائل سے ناواقف ہوتا ہے، قرآن مجید کی چھوٹی چھوٹی سورتیں بھی صحیح ڈھنگ سے نہیں پڑھ پاتا، اسلام کے بنیادی عقائد، اور وہ ضروریات دین جن پر ایمان کا دارومدار ہے اس کا بھی علم نہیں رکھتا، کیا شہر، کیا گاؤں اور دیہات ہر جگہ بقدرِ ضرورت دینی تعلیم کا فقدان ہے، بل کہ مسلم معاشرہ دینی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت ہی کو سرے سے نظر انداز کر رہا ہے اور سارا زور صرف اور صرف عصری علوم کو حاصل کرنے پر لگا رہا ہے، اعلیٰ نوکری اور عمدہ جاب کے چکر میں دین وشریعت کی پاسداری کا لحاظ بھلا بیٹھا ہے، دنیوی تعلیم کا حصول شریعت میں منع نہیں ہے لیکن شریعت کو پس پشت ڈال دینا اور دینی تعلیم سے یکسر غافل ہو کر زندگی گذارنا دنیا میں بھی نقصان دہ اور آخرت میں بھی موجِب عقاب ہے، حالانکہ دین کا اتنا علم سیکھنا کہ جس کے ذریعہ انسان شریعت کے مطابق اپنی زندگی گزار سکے، ہر کلمہ گو پر فرض ہے، خواہ اس کا تعلق عقائد سے ہو یا عبادات سے، معاملات سے ہو یا معاشرت سے، چنانچہ ارشاد نبوی ہے: طلب العلم فریضة علی کل مسلم. (رواہ ابن ماجہ)۔

علم دین سے بیزاری اور اس کے نقصانات

یہ حقیقت ہے کہ جب تک انسان کو احکام خداوندی اور تعلیماتِ نبوی کا علم نہیں ہوگا اس وقت تک یقیناً ان پر عمل پیرا ہونا بھی ناممکن اور مشکل ہوگا اور جب دین سے ناواقفیت کی وبا عام ہوگی تو امت طرح طرح کی پریشانیوں اور دشواریوں کا شکار ہوجائے گی، چنانچہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے:

ترجمہ: بلا شبہ اللہ رب العزت علم دین کو اچانک (بندوں کے سینوں سے) نہیں ختم کرے گا، لیکن وہ علماء کرام کو وفات دے کر علم دین کو ختم فرمائے گا، یہاں تک کہ جب کوئی عالم (دین کا ضروری علم رکھنے والا) باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا راہنما اور راہبر بنالیں گے اور ان ہی سے مسائل پوچھیں گے، وہ لوگوں کو بغیر جان کاری کے فتوی دیں گے اور مسائل بتائیں گے، جس کی وجہ سے خود بھی گم راہ ہوں گے اور عوام کو بھی گم راہ کریں گے۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ المصابیح:33)

ذرا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس جامع فرمان پر غور کیجئے!! اور دیکھیے کہ علم دین کے سلسلے میں معاشرہ کی کیا صورت حال ہے؟ درحقیقت حدیث شریف میں جو صورت حال بتائی گئی ہے اس وقت من وعن اسی صورت حال سے ہمارا معاشرہ گذر رہا ہے، علوم دینیہ سے بے رغبتی عام ہوگئی ہے لوگوں کو دین اور علم دین سے کوئی رغبت نہیں رہی اور عام لوگ جاہلوں کو ہی اپنا سردار اور راہ نما بنا چکے ہیں، ان ہی سے مشورے کرتے ہیں حد تو یہ ہے کہ اب

ان ہی سے مسائل بھی پوچھ رہے ہیں، بے دینی کے عام ہونے اور علم دین سے بے رغبتی اور علماء دین کی تحقیر کی بنا پر آج عوام خود بھی گمراہی کے شکار ہیں اور اوروں کو بھی اس گمراہی میں گھسیٹ رہے ہیں، جس کے نتیجہ میں آج مسلمان عقائد واحکام میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہیں، عبادات ومعاملات کی ادائیگی میں غافل ہیں، معاشرت ومعیشت کے اسلامی اصول سے بالکلیہ ناواقف ہیں، حقوق اللہ ہو یا حقوق العباد دونوں کی ادائیگی پر کوئی توجہ نہیں ہے، ذہنوں میں صبح وشام، رات ودن حرام اور حلال کی تمیز کے بغیر صرف دولت جمع کرنے کی فکر سوار ہے (الا ماشاء اللہ)۔

علم دین سے دوری امت مسلمہ کے زوال کا سبب

مسلم اُمۃ کے زوال کے اسباب پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قوم مسلم کی تباہی میں جہاں اغیار کی سازشیں ہیں وہیں ہماری کوتاہیوں کا بھی عمل دخل ہے، ہمارا زوال ہماری غفلت کا ہی نتیجہ ہے، ہم اس وقت مٹائے گئے جب ہم نے اپنے دین سے رشتہ کمزور کرلیا، ہم اس وقت فنا کیے گئے جب ہم نے اپنی ہی شناخت مٹادی، اپنا چہرہ، اپنا وقار، اپنا لباس، اپنی تہذیب وتمدن سے بغاوت نے ہمیں ذلت کی پستی میں ڈال دیا، جب تک علم دین سے وابستگی رہی؛ مسلمانوں نے علم وفضل کی بلند چوٹیوں پر کامیابیوں کے علم لہرائے۔

یادرکھیں!! دنیوی علم مادی دنیا تک ہی وفا کرتا ہے، دنیوی علم سے احکام خداوندی اور تعلیماتِ نبوی کا علم ہونا تو کیا کبھی کبھی انسان اسکا منکر بھی ہوجاتا ہے، توحید، رسالت، اور آخرت یہ تین بنیادی عقائد علم دین سے ہی حاصل ہوسکتے ہیں، علم دین ہی سے حلال وحرام کی تمیز ہوسکتی ہے، مقصد تخلیق کی ادائیگی کا راز علم دین کے حصول میں ہی پنہاں ہے، یہی وہ علم ہے جسے رب رحمان نے نبی رحمت ﷺ کو **اقرأ** کے ذریعے سکھلایا ہے لہذا ضرورت ہے کہ ہم علم دین سے روگردانی کے بجائے اسکی اہمیت، ضرورت اور افادیت کو تسلیم کریں، نہ صرف تسلیم کریں بلکہ اس سے منقطع رشتہ استوار کریں، علم دین کے حصول میں اپنے آپ کو اپنی اولاد کو اپنے خاندان کو تیار کریں اگر ہم آج اس سے روگردانی کریں گے تو شاید آنے والی نسلوں کا دین اسلام اور شریعت محمدی پر باقی رہنا مشکل ہوجائے گا مغربیت کے اس طوفان بلاخیز میں ایمان کا باقی رہنا کافی مشکل ہے لہذا ابقدر ضرورت دنیوی تعلیم کے حصول کے ساتھ دینی تعلیم کو ہر شخص اپنی ضرورت سمجھ کر حاصل کرے اور دنیوی واخروی فلاح حاصل کرنے کی سعی کرے دعا ہے کہ اللہ پاک علم دین کی صحیح قدردانی کی توفیق عطا فرمائے اور مادیت کے اس خطرناک دور میں علم دین کی شمع کو ہر تاریک گھر میں پہنچائے۔ آمین ثم آمین یارب العالمین

اصلاحی مضامین

اسلام میں کردار سازی کی اہمیت وضرورت

از: حضرت مولانا اسرار الحق قاسمیؒ

گزشتہ دو تین صدیوں سے عالمی پیمانے پر اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ کو مسخ کرنے کی جو مہم چل رہی ہے، اس میں روز بروز تیزی ہی آتی جارہی ہے۔ پہلے ایک جھوٹ یہ پھیلایا گیا کہ اسلام ایک انتہا پسند مذہب ہے اور اسے ماننے والے سارے کے سارے مسلمان انتہا پسند ہیں، دہشت گردی کا ہوا کھڑا کیا گیا اور اس میں بھی مسلمانوں کو ہی ملوث کیا گیا۔ رفتہ رفتہ ایسا ماحول بن گیا کہ دنیا بھر میں جہاں کہیں کوئی قتل وغارت گری کا واقعہ رونما ہو لوگوں کا ذہن فوراً کسی مسلمان کی طرف جاتا ہے اور عام طور پر نام نہاد تحقیقات کے نتائج بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ پھر اس دہشت گردی کو خود مسلمان ملکوں پر تھوپ دیا گیا، چنانچہ اس وقت ہم دیکھ رہے ہیں کہ محض گزشتہ دس سال کے اندر خلیج کا نقشہ کچھ سے کچھ ہو گیا ہے، افریقی عربی ملک تہہ وبالا ہو چکے ہیں، اربوں کا مالی اور لاکھوں کا جانی نقصان ہو چکا ہے اور عام انسانی زندگی ہر لمحہ خطرات سے دوچار ہے۔ حالاں کہ انتہا پسندی یا دہشت گردی کا مسلمانوں پر الزام خالص جھوٹ اور عالمی استعمار کی سازشوں کا حصہ تھا، مگر اسے اتنی بار دوہرایا گیا کہ ساری دنیا نے اس بات کو حقیقت مان لیا اور اس وقت خود مسلمان اس دہشت گردی کے سب سے زیادہ شکار ہیں۔

دوسری طرف دنیا میں ایک بڑا طبقہ ایسا بھی پایا جاتا ہے، جو مسلمانوں کو اخلاقی طور پر پسماندہ سمجھتا ہے۔ گویا ان کی نظر میں مسلمان بد اخلاق ہیں، وہ لوگوں کے ساتھ صحیح برتاؤ نہیں کرتے، وہ جھوٹ بولتے ہیں، وعدہ خلافی کرتے ہیں، آپس میں لڑتے ہیں اور وہ جرائم میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے بارے میں متعدد سوسائٹیوں میں یہ رائے بھی پائی جاتی ہے کہ وہ صفائی ستھرائی کا خیال نہیں رکھتے اور گندے رہتے ہیں، ان کی بستیوں میں غلاظت پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے مسلکی تنازعات اور باہمی اختلافات کو بھی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہوئے بہت سے لوگ یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ مسلمان اپنی جہالت اور غیر مہذب ہونے کی وجہ سے باہم دست وگریباں رہتے ہیں اور ان کا معاشرہ آپسی جھگڑوں اور خانہ جنگیوں سے عبارت

ہے، اس طرح کی باتیں بنا کر مسلمانوں کی شبیہ کو منفی انداز میں پیش کرنے کا عمل برابر جاری ہے، جس کا نقصان مسلمانوں کو ہر سطح پر اٹھانا پڑ رہا ہے اور اگر یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا تو انہیں مزید مسائل کا سامنا کر پڑ سکتا ہے۔

یہاں دو باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ تمام الزامات جو مسلمانوں کے خلاف لگائے جا رہے ہے، صد فیصد درست نہیں بلکہ بعض الزامات تو محض مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ ہیں۔ جیسے کہ مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کا الزام۔ کیونکہ مسلمان جس دین کی پیروی کرتے ہیں، وہ امن کا داعی ہے اور نہ صرف امن وامان کی تعلیم دیتا ہے، بلکہ امن کے قیام کے لیے ایک جامع وموثر نظام بھی پیش کرتا ہے۔ اسلام کا امن پر مبنی یہ نظام اس قدر مستحکم اور موثر ہے کہ اگر اس کو آج کی دنیا میں جب کہ ہر طرف خوف و ہراس اور بدامنی پائی جاتی ہے، نافذ کر دیا جائے تو پوری دنیا میں امن کی ہوائیں چلنے لگیں گی۔ ظاہر سی بات ہے کہ جو دین خود امن کا علمبردار اور دہشت گردی کا مخالف ہو، اس کے ماننے والے کیسے دہشت گرد ہو سکتے ہیں؟ اس تناظر میں مسلمانوں کو بحیثیت قوم دہشت گرد کہنا کھلی بددیانتی اور زیادتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ اقوام وملل جو تمام مسلمانوں پر بداخلاقی، تاریک خیالی، بدعنوانی، جرائم اور انسانی قدروں کی پامالی کا الزام لگاتی ہیں وہ خود اپنا محاسبہ کریں کہ وہ جرائم میں ملوث ہیں یا نہیں، بدعنوانی، چوری ڈکیتی، قتل و غارت گری، کذب گوئی، بداخلاقی اور انسانیت کی پامالی ان میں پائی جاتی ہے یا نہیں؟ جس بڑے پیمانہ پر آج خود کو مہذب کہنے والی قومیں بدعنوانی کی مرتکب ثابت ہیں اور انسانیت کا گلا گھونٹ رہی ہیں، انہوں نے دنیا کو نت نئے مسائل سے دوچار کر دیا ہے اور تباہی کے دہانے پر کھڑا کر دیا ہے۔ ان اقوام کو چاہئے کہ وہ بے حیائی، فحاشی، زنا کاری، ناانصافی، فریب دہی اور اپنے مفاد کے لیے دنیا پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے سے باز آئیں، تاکہ دنیا تباہی سے بچ سکے۔

البتہ ہمیں اس حقیقت کو ایک حد تک تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلم معاشرے میں اخلاقی اعتبار سے بہت سی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ بحیثیت مذہب کے اسلام نے تو پوری انسانی زندگی کا ایک نظام ہمیں دیا ہے، مگر اس نظام پر عمل کتنا کیا جا رہا ہے یہ قابلِ غور ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ سچ بولو، وعدہ پورا کرو، عہد شکنی نہ کرو، باہم مت جھگڑو، بھائی بھائی بن کر رہو، کسی کا دل مت دکھاؤ، جو لوگ ضرورت مند ہیں ان کی ضرورتوں کو پورا کرو، انصاف قائم کرو، کسی پر زیادتی مت کرو، حقوق کو پورا کرو، عورتوں کے حقوق کو بھی، پڑوسیوں کے حقوق کو بھی، محلہ والوں کے حقوق کو بھی، مسلمانوں کے حقوق کو بھی اور غیر مسلموں کے حقوق کو بھی ادا کرو، کسی کا قتل مت کرو، چوری نہ کرو، زنا کے قریب بھی مت جاؤ، بے حیائی سے دور بھاگو، حلال رزق کھاؤ، اخوت ومساوات کا مظاہرہ کرو، اپنے بچوں کی

اچھی طرح تربیت کرو، امانت ودیانت داری کو اور ظاہری وباطنی صفائی کو اپنا شعار بناؤ، دنیا اور آخرت دونوں جہان میں کامیاب ہونے کی فکر ودعا کرو۔ مگر آج ایسے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ہے، بلکہ ایسے ہی لوگ زیادہ ہیں جن کی زندگیوں میں اسلام نظر نہیں آتا، بہت سے لوگ ہمیں ایسے دکھائی دیتے ہیں، جو بدعنوانی اور جرائم میں بھی ملوث ہیں، بہت سے ایسے بھی دکھائی دیتے ہیں کہ جن کے اخلاق بہترین نہیں، ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جو کذب گوئی، وعدہ خلافی اور عہد شکنی میں آگے آگے رہتے ہیں، ناانصافی، عدم مساوات، اونچ نیچ کا فرق، باہمی تنازعات اور بدکرداری بھی ہمیں مسلمانوں میں خوب نظر آتی ہے اور مسلم معاشرہ میں بعض ایسی چیزیں صاف دکھائی دیتی ہیں جو اسلام کے منافی ہیں اور انسانیت کے بھی۔ بھلے ہی یہ ساری باتیں دیکھنے میں کتنی ہی چھوٹی نظر آئیں، مگر وہ حقیقت کے اعتبار سے کافی بڑی ہیں اور اسلام ومسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کا سامان فراہم کررہی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اپنی عملی زندگی میں اسلامی تعلیمات کو نافذ کریں اور اپنے انفرادی واجتماعی کردار کو بہتر وبلند کرنے کے لئے ان تمام اصولوں پر عمل کریں، جن کی طرف قرآن وسنت میں ہدایت کی گئی ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرن اول میں حیرت انگیز تیزی کے ساتھ اسلام کے دنیا کے ایک بڑے حصے میں پھیلنے کی ایک بڑی وجہ اس زمانے کے مسلمانوں کا پختہ اور مثالی کردار واخلاق بھی تھا، بڑے سے بڑا دشمن ان کے کردار کو دیکھ کر دوست بن جاتا تھا اور کٹر مشرک اور کافر بھی کلمہ پڑھ کر دامن اسلام سے وابستہ ہوجاتا تھا۔ افسوس کہ آج ہمارے اخلاق وکردار کو دیکھ کر دوسرے مذہب کے لوگ متاثر ہونے کے بجائے بدظن ہوتے ہیں اور وہ ہماری بدعملیوں کا رشتہ سیدھے اسلام سے جوڑتے ہیں، حالاں کہ اسلام کی تعلیمات تو آج بھی اپنی جگہ مبنی برصداقت اور مسلم ہیں اور ان کی بنیاد خالص خدائے تعالیٰ کی وحی اور انسانیت کے عالمگیر جذبے پر قائم ہے، بس ضرورت یہ ہے کہ جس طرح قرن اول کے مسلمانوں نے انہیں اپنا کر دین کی سربلندی ومقبولیت کا پرچم لہرایا تھا اسی طرح اگر آج کے مسلمان بھی ان تعلیمات کو اپنی زندگیوں میں اتارلیں تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے تئیں لوگوں کی بدگمانی دور ہوجائے گی بلکہ وہی لوگ اسلام کے قریب آنا چاہیں گے، جو آج اس سے وحشت زدہ ہیں۔

اصلاحی مضامین

خیر امت کے بدترین حالات: اسباب وحل

از: مولانا امداد الحق بختیار قاسمی*

ایک طائرانہ اور سرسری نگاہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے موجودہ احوال پر ڈالی جائے، برما ہو یا شام، فلسطین ہو یا افغانستان، افریقہ ہو یا امریکہ، عراق ہو یا یمن، ہر ملک اور دنیا کے ہر خطہ میں مسلم قوم تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہی ہے، پورا کرۂ ارض مسلمانوں کے خون سے رنگین کیا جارہا ہے، دنیا کا یہ گھروندہ اور یہ سیارہ ارضی ہر طرف سے مسلمانوں کی آہ وبکا اور چیخ وپکار سے گونج رہا ہے، اس دور ظلم وستم میں مسلمان کا خون سب سے آسان اور ارزاں ہوگیا ہے، نیز دنیا کے کسی گوشہ سے بھی مسلمانوں کی ہمدردی اور حمایت میں کوئی آواز نہیں اٹھ رہی ہے۔

ایک منظم اور گہری سازش کے ساتھ دنیا کے ہر آباد خطہ میں امت مسلمہ کو نشانہ بنایا جارہا ہے، ایسا لگتا ہے کہ تمام اقوام عالم نے کوئی ٹھوس اور انتہائی خطرناک معاہدہ اور اتفاق کیا ہو، جس معاہدہ پر دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام طاقتیں عمل پیرا نظر آتی ہیں۔ امت مسلمہ کی جان ومال، عزت وآبرو اور دینی وملی تشخص سب داؤ پر ہیں، مسلمانوں کے اقتصادی ذرائع بھی نشانہ پر ہیں، جان بھی خطرے میں ہے، عزت وآبرو بھی پامالی کی دہلیز پر ہے اور دین ومذہب تو اغیار کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے۔ تمام اقوام عالم نے یک زبان ہوکر دہشت گردی کو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ جوڑ دیا ہے، جس کی وجہ سے ہر جگہ کے مسلمان شک کی نگاہ سے دیکھے جارہے ہیں، نیز مذہبی اور جنسی تشدد کے بھی شکار ہورہے ہیں۔

ایک جانب مسلم امت کی پوری دنیا میں یہ بدترین حالت ہے، جس سے بالکل صاف اور واضح نظر آتا ہے کہ اس وقت سب سے زیادہ پریشان، مصیبت زدہ، بدنام اور پیچھے (Back word) مسلمانوں کے علاوہ کوئی دوسری قوم نہیں، دوسری جانب ہم قرآن کریم میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے حوالے سے ارشاد فرماتا ہے: ”تم بہترین امت ہو“ یعنی دنیا کی سب سے اچھی امت ہو؛ حالانکہ سب سے اچھی امت اسے کہتے

* استاذ جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدر آباد

جسے دنیا میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جائے، دیگر اقوام جسے نمونہ بنائیں، اس کی پیروی کی جائے، اس کی تہذیب کو اپنایا جائے نیز وہ ایسی امت ہو کہ خوش حالی کی زندگی گزارے، تمام طرح کی دنیاوی پریشانیوں سے مامون ومحفوظ ہو۔

ان میں سے کوئی چیز بظاہر امت مسلمہ میں دیکھنے کو نہیں ملتی، جس کی وجہ سے ذہن میں یہ سوال گردش کرتا ہے کہ مسلمان "بہترین امت" کیسے ہیں؟ جب کہ ہمارا کامل ایمان وراسخ عقیدہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فرمان میں کسی طرح کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيلاً" اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہوگی۔!

دراصل یہ جملہ کہ "تم بہترین امت ہو" اللہ تبارک وتعالیٰ کا دعویٰ محض نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے "خیر امت" کی علت اور اس کا سبب یا کہیے کہ اس کی شرط اور وصف بھی بیان کیا ہے، اب ہمیں غور کرنا چاہیے کہ امت میں یہ وصف باقی ہے یا نہیں، ظاہر ہے کہ اگر اللہ کی طرف سے بیان کردہ شرط امت میں باقی نہ ہو تو یہ امت "مقام خیریت" پر کیسے برقرار رہ سکتی ہے۔!

اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدس کلام میں اس امت کے "بہترین" ہونے کا راز یہ بیان فرمایا ہے: "اخرجت للناس" یعنی یہ امت دوسرے لوگوں کے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہے، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس امت کو اس دنیا میں اس لیے بھیجا گیا ہے تاکہ وہ تمام انسانیت کی فکر لے کر زندگی گزارے، یہ کتنا ہمہ گیر مفہوم ہے اور اس چھوٹے سے جملہ میں اللہ تعالیٰ نے کتنی بڑی ذمہ داری اس امت کے کاندھے پر ڈالی ہے، یہ مختصر سا جملہ پوری زندگی، پوری انسانیت اور اس کی تمام تر ذمہ داریوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، اب غور کریں کہ اس امت میں یہ عنصر اور جذبہ اور اس کی عملی شکل باقی رہی یا نہیں، یہ آیت ہمیں دعوتِ محاسبہ دیتی ہے اور زندگی کے صرف چند گوشوں کا محاسبہ نہیں؛ بلکہ ایک ہمہ جہت محاسبہ کی دعوت دیتی ہے، جو تمام شعبہ ہائے زندگی کو محیط ہو۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدے بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ یہ امت اپنے لیے، اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے، صرف اپنی زندگی جینے کے لیے اور صرف اپنے آپ سے مطلب رکھنے کے لیے پیدا نہیں کی گئی؛ بلکہ اس امت کی خصوصیت یہ ہے

کہ تمام اقوام اور مخلوقات اپنی زندگی جینے کے لیے پیدا کی گئی ہیں اور یہ امت دوسروں کی بہبودی کی فکر کے لیے پیدا کی گئی ہے، اپنی زندگی تو ایک جانور بھی جی لیتا ہے، اس امت کا امتیاز یہ ہے کہ اسے ایک بڑی ذمہ داری دے کر بھیجا گیا ہے، ایک ہمہ گیر ہمہ جہت ذمہ داری اور وہ ہے زندگی کے تمام شعبوں میں دیگر لوگوں کی فلاح و بہبود کی فکر کرنا۔

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اور اس سے مراد صرف عبادات کی فکر نہیں ہے؛ بلکہ زندگی کے تمام مراحل کی فکر ہے، اس آیت کے مطابق مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں لوگوں کی خدمت کرنی چاہیے، ان کی صحیح اور کامیاب راہنمائی کرنی چاہیے، نقصانات اور خسارہ سے انسانوں کو بچانا چاہیے، نیز آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”لوگوں کے لیے“ یہ نہیں فرمایا: ”مسلمانوں کے لیے“ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت پر صرف مسلمانوں کی ذمہ داری نہیں ڈالی؛ بلکہ تمام اقوام عالم کی کامیاب زندگی کا عظیم فریضہ اس امت کے حوالے کیا گیا ہے۔

یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام اقوام کی، زندگی کے تمام شعبوں میں خدمت اور راہنمائی کرنا، تعلیم کے بغیر ممکن نہیں؛ لہذا اس سے یہ نتیجہ بآسانی نکلتا ہے کہ مسلمانوں کو دنیا کے تمام مباح اور جائز علوم وفنون میں مہارت حاصل کرنی چاہیے؛ کیوں کہ اس کے بغیر کسی کی خیر خواہی اور اس کی صحیح راہنمائی اور نقصان سے اسے بچانا ممکن نہیں، جب تک مسلمان تعلیم کے میدان میں نمایاں مقام حاصل نہیں کریں گے، وہ ”خیر امت“ کا فریضہ ادا نہیں کر سکتے اور ”اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ“ کی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

اسی کے ساتھ دینی تعلیم کی جانب بھی توجہ انتہائی ناگزیر ہے؛ کیوں کہ مسلمانوں کے لیے اسلامی تعلیم وہی حیثیت رکھتی ہے، جو حیثیت روح کی جسم کے اندر ہے، جیسے روح کے بغیر جسم ایک لاش ہے، اسی طرح اسلامی تعلیم کے بغیر مسلمان بھی لاشئ ہے یا زندہ لاش کی طرح ہے، مسلمانوں کو اس دنیا میں رہبری اور قیادت کا فریضہ انجام دینا ہے؛ مگر دیگر اقوام کے تہذیبی دھارے میں ضم ہو کر اور ان کے تہذیبی بہاؤ میں بہہ کر نہیں؛ بلکہ یہ کام اسلامی شناخت اور پہچان کے ساتھ کرنا ہے، جیسے دنیا کی ہر ٹیم اپنی الگ شناخت کے ساتھ کام کرتی ہے، رضاکارانہ خدمات انجام دینے والے اداروں کے ممبران کی مستقل پہچان ہوتی ہے، فوج کی الگ پہچان ہوتی ہے، ڈاکٹرس کی الگ پہچان ہوتی ہے، یعنی جتنی ذمہ دار جماعتیں ہیں ان کی ایک الگ شناخت ہوتی ہے۔

اس طرح مسلمان عام لوگ نہیں ہیں؛ بلکہ ایک ذمہ دار ملت ہے، اور اس کی ذمہ داری ہمہ گیر بھی ہے،

ہمہ جہت اور دائمی بھی؛ لہٰذا مسلمان کا اندرون بھی اسلامی تعلیمات، اخلاق اور عقائد سے مُشک بار ہونا چاہیے اور ظاہری وضع قطع بھی اسلامی تعلیمات کے ساتھ آراستہ ہو، دیکھنے والے کو ایک مسلمان ہر اعتبار سے ممتاز لگے، ظاہر سے، اخلاق سے، معاملات سے اور شب روز کے معمولات سے دیکھتے ہی معلوم ہو کہ یہ کوئی مسلمان ہے اور ہم دنیا کے اس سفر میں ایسی خوب صورت مثال قائم کریں کہ دنیا والے ہمارے اخلاق و کردار کی مثالیں دیں، ہمارے لباس کی نقل اتاریں اور ہمارے دین و مذہب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ ؎

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود

خلاصہ یہ کہ اس آیت کی روشنی میں مسلمانوں کی موجودہ پریشان حالی کے اسباب یہ ہیں کہ وہ لاشعوری اور غفلت کی زندگی گزار رہے ہیں؛ جب کہ انھیں اس ذمہ داری کے ساتھ دنیا میں بھیجا گیا ہے کہ وہ اس معاشرہ میں بسنے والے تمام افراد کے نفع ونقصان کی فکر کریں؛ مگر وہ اپنی ذاتی زندگی میں گھر کر اپنی اس عظیم ذمہ داری کو بھول بیٹھے؛ دوسرا سبب یہ ہے کہ مسلمان تعلیمی اور فنی میدان میں بہت پیچھے رہ گئے اور تعلیم کے بغیر کسی قوم کی کسی بھی میدان میں صحیح راہنمائی کرنا محض خواب وخیال ہے؛ تیسرا سبب یہ ہے کہ دین سے ان کا رشتہ بہت کمزور پڑ چکا ہے؛ چنانچہ دینی تعلیمات، اسلامی طرز زندگی اور اسلامی اخلاق ان کی زندگی سے عنقا ہو رہے ہیں، وہ دیگر اقوام کی لادینی تہذیبوں میں فنا ہو گئے۔

لہٰذا مسلمانوں کو ان تینوں اسباب میں غور کرنا چاہیے اور ان تینوں کی طرف سنجیدہ اقدامات کرنے چاہیے، انشاء اللہ کامیابی وکامرانی ان کا مقدر ہوگی اور زمین کی سربراہی اور دیگر اقوام کی قیادت وسیادت انھیں حاصل ہوگی، وہ ایک قائد امت بن کر دوبارہ ابھر سکیں گے اور پوری دنیا انھیں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے گی، اللہ کا پاک ارشاد ہے: وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (آل عمران: ۱۳۹) ”نہ آئندہ کے لیے ہمت ہارو اور نہ (موجودہ اور گزرے ہوئے تکلیف دہ حالات پر) غم کرو، تم ہی سر بلند رہو گے؛ شرط یہ ہے کہ تم ایمان پر قائم رہو۔“ (آل عمران: ۱۳۹)

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

اصلاحی مضامین

الحاد کی کہانی

مولانا خالد سیف اللہ صدیقی قاسمی*

مولانا عبد الماجد دریابادی مشہور عالم دین اور معروف ادیب وقلم کار اور انشا پرداز گزرے ہیں۔ ایک دن میں ان کے ایک سفرنامے "سیاحت ماجدی" کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس دوران میری نظر مولانا کے الحاد، اس کے اسباب اور پھر دوبارہ اسلام کی طرف واپسی کی روداد پر پڑی۔ مجھے وہ بہت پسند آئی؛ اس لیے کہ اس میں جس نوع کے اسباب بیان ہوئے تھے، اس نوع کے یا اس سے ملتے جلتے اسباب موجودہ دور میں بھی پائے جاتے ہیں میں نے سوچا موجودہ دور" دور الحاد" کہلاتا ہے؛ کیوں نہ یہ روداد منظر عام پر لائی جائے کہ شاید بعض لوگوں کو اس خطرناک اور بھیانک فتنے سے کچھ آگاہی حاصل ہو جائے، تو پیش ہے مولانا کی کہانی خود مولانا کے قلم سے:

ہائی اسکول پاس کر کے داخلہ کالج میں ہوا۔ اب ۱۹۰۸ آ گیا۔ اب مستقل رہنا سہنا لکھنو میں شروع ہوا، جہاں کمی نہ کتابوں کی تھی اور نہ انگریزی قسم کے کتب خانوں کی۔ ادھر لپکا کتب بینی کا پڑا ہوا تھا، جو کتاب بھی سامنے پڑ گئی بس اسے کتاب کے کیڑے کی طرح چاٹ گیا۔ کوئی یہ بتانے والا تھا نہیں کہ کتاب ہے کس نوعیت اور کس پائے کی؟ اتفاق کی بات کہ شروع ہی میں سابقہ جس کتاب سے پڑا وہ ایک سخت ملحد قسم کے انگریز ڈاکٹر کی تھی۔ الحاد کا راز تو بہت دنوں بعد کھلا۔ ظالم نے پیرایہ بیان تمام تر عملی یا بہ قول خود سائنٹفک اختیار کیا تھا، بہ ظاہر مذہب سے یقیناً یا اثباتاً اسے کوئی تعلق ہی نہ تھا؛ لیکن حقیقتاً اس کی ہر تعلیم کی زد آ کر مذہب ہی پر پڑتی تھی؛ خصوصا دینی اخلاق پر۔ سولہ برس کے سن کی بساط ہی کیا؟ تاثر کے شباب کا زمانہ، جوں جوں مطالعہ آگے بڑھا، طبیعت اثر قبول کرتی گئی۔ یہاں تک کہ چند سو صفحے کی کتاب جب ختم کی ہے تو اندر ہی اندر چپکے ہی چپکے قلب میں ایمان کی نورانیت کی جگہ الحاد کی ظلمانیت لے چکی تھی۔

بنیاد یوں پڑی، تائیدی اسباب قدم قدم پر ملتے گئے۔ ایک لائبریری میں ایک کتاب اور نظر پڑی، موضوع مذہب نہیں تاریخ اور ادب تھا۔ دنیا کے مشاہیر کے ادب پارے اس میں درج تھے اور اسی سلسلے میں قرآن مجید کے اقتباسات بھی۔ اسی کتاب میں پورے صفحے پر تصویر نعوذ باللہ! عرب مصنف قرآن کی یعنی

* فاضل دار العلوم دیوبند

ہمارے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی درج تھی اور یہ نہ پوچھیے کہ وہ کس درجہ زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ جسم پر عبا، سر پر عمامہ؛ لیکن کمر میں ایک طرف پیش قبض، دوسری طرف تلوار اور اس سے بڑھ کر یہ کہ شانے پر ترکش اور کمان! تیوروں پر بل پڑے ہوئے اور چہرے سے خاکم بہ دہن تمام تر خشونت ٹپکتی ہوئی! تصویر کسی پیغمبر یا رحمت عالم پیمبر یا پیمبر کی تو خیر کیا ہوتی، کسی معمولی درجے کے شریف اور رحم دل انسان کی بھی ہرگز نہیں معلوم ہوتی تھی۔ صاف ایک جلاد قسم کے ڈاکو کی معلوم ہوتی تھی۔ نیچے تصویر کا تاریخی حوالہ بھی درج تھا۔ تصویر کے نقلی اور فرضی ہونے کی طرف ذہن تو اس وقت جا ہی نہ سکتا تھا، قدرتاً صاحب تصویر کی شخصیت سے متعلق انتہائی بدعقیدگی پیدا ہو کر رہی۔ انا للہ!

جب بی۔ اے میں پہنچا تو فلسفہ اور نفسیات کی کتابوں کے پڑھنے کا ہوکا تھا۔ ایک نامور ڈاکٹر کی دو ضخیم کتابیں منٹل فزیالوجی اور منٹل پبھولوجی کے نام سے مطالعے میں بڑی عقیدت کے ساتھ آئیں، ان میں بدبخت نے یہ کمال کیا تھا کہ مرض صرع کا بیان کرتے کرتے ایک دم سے (بیان) اس میں یہ لے آیا کہ انبیاء کی بعض مشہور ترین اور عظیم ترین ہستیاں بھی اس قسم کے دوسرے مرض میں مبتلا رہی ہیں؛ چناں چہ نزول وحی کے وقت کے آثار و علامات کا شمار مرض میں کر ڈالا۔ اب فرمایئے کہ ایک سادہ دل مسلم نوجوان کے دل و دماغ پر پیہم حملے جب اسی قسم کے ہوں تو وہ بے چارہ اپنے ایمان کو کب تک سلامت رکھ سکتا تھا؟ نتیجہ قدرتاً وہی نکلا جو نکلنا تھا۔ قلب میں الحاد اور ارتیاب پیوست ہوگیا اور دماغ اپنے کو مسلم کہلانے کے بجائے "نیشنلسٹ" اور "ایگناسٹک" کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگا۔ مل، اسپنسر، ہکسلے وغیرہ کی تصانیف اس کڑوے کریلے کو اور نیم چڑھا بناتی گئیں۔ عام مولوی، ملا اور مشائخ ایسے مرض کا علاج قطعاً نہیں کر سکتے، ان کے علاج مفید ہونے کے بجائے الٹے مضر ہی ثابت ہوتے ہیں۔ یہ نشہ دو ایک دن نہیں، کوئی آٹھ دس سال متواتر جما رہا۔ اللہ کا فضل اتنا رہا کہ اس ساری مدت میں تعلق عقیدت حضرت اکبر الہ بادی سے بھی قائم رہا اور وہ حضرت کمال حکمت سے کھل کر نہیں؛ لیکن چپکے ہی چپکے اپنے لطیفوں اور چٹکلوں کے ذریعے سے دین کی تبلیغ برابر کرتے گئے اور اپنے کلام بلاغت نظام سے مادیت اور فرنگیت سے مرعوبیت دماغ سے ہٹاتے گئے۔ دوسری رہ نما ہستی اسی زمانے میں مولانا محمد علی جوہر ایڈیٹر" کامریڈ" کی ہوئی، اس وقت تک وہ خود مولانا نہ تھے، محض آکسن تھے؛ لیکن ان کا جوش اسلامی اس وقت بھی بھلا تبلیغ کیے بغیر کب ماننے والا تھا۔ جب ملتے یا خط لکھتے اس نامسلم کو مسلمان بنانے کی کوشش میں لگے رہتے۔ یہ دونوں ضابطے سے نہ مولانا تھے نہ مشائخ؛ لیکن سننے کی بات صرف یہ ہے کہ ایک بھاگے ہوئے غلام کو اس کے مالک کی طرف پھیر کر لانے میں حد درجہ معین ہوتے رہے۔۔۔ (بقیہ صفحہ: ۲۳ پر)

تابندہ نقوش

اورنگ زیب عالمگیرؒ تاریخ کا مظلوم حکمراں

تحریر: حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہٗ *

ہندوستان پر جن مسلم خاندانوں نے حکومت کی ہے، ان میں غالباً سب سے طویل عرصہ مغلوں کے حصہ میں آیا ہے، جو ۱۵۲۶ء سے لے کر ۱۸۵۷ء یعنی تقریباً ساڑھے تین سو سال کے عرصہ پر محیط ہے، اس دوران اگرچہ ہمیشہ پورے ملک پر مغلوں کو دورِ اقتدار حاصل نہیں رہا اور بہت سے علاقے ان کے قبضہ میں آتے اور جاتے رہے؛ لیکن تقریباً اس پورے عرصہ میں وہ قوتِ اقتدار کی علامت بنے رہے، اس خاندان کا چھٹا فرمانروا اورنگ زیب عالمگیرؒ تھا، عالمگیر ۱۶۱۸ء میں ممتاز محل کے بطن سے پیدا ہوئے اور ۱۷۰۷ء میں وفات پائی، گویا پورے نوے سال کی طویل عمر پائی، پھر اس کی خوش قسمتی ہے کہ ۱۶۵۷ء سے لے کر ۱۷۰۷ء تک یعنی تقریباً پچاس سال اس نے حکومت کی اور اس کے عہد میں ہندوستان کا رقبہ جتنا وسیع ہوا، اتنا وسیع نہ اس سے پہلے ہوا اور نہ اس کے بعد، یعنی موجودہ افغانستان سے لے کر بنگلہ دیش کی آخری سرحدوں اور لداخ وتبت سے لے کر جنوب میں کیرالہ تک وسیع وعریض سلطنت کا قیام اسی بادشاہ کی دَین ہے۔

اس کی اخلاقی خوبیوں پر تمام مؤرخین یہاں تک کہ اس کے مخالفین بھی متفق ہیں کہ یہ تختِ شاہی پر بیٹھنے والا ایک درویش تھا، جو قرآن مجید کی کتابت اور ٹوپیوں کی سلائی سے اپنی ضروریات پوری کرتا تھا، یہاں تک کہ اس نے اپنی موت کے وقت وصیت کی کہ اس کی اسی آمدنی سے تجہیز وتکفین کی جائے، ایسے زاہد، درویش صفت، قناعت پسند اور عیش وعشرت سے دُور بادشاہ کی نہ صرف ہندوستان؛ بل کہ تاریخِ عالم میں بھی کم مثالیں مل پائیں گی، یہ تو اس کی ذاتی زندگی کے اوصاف ہیں، اس کے علاوہ اورنگ زیبؒ نے اپنے عہد میں غیر معمولی اصلاحات بھی کیں، ترقیاتی کام کئے، نامنصفانہ احکام کو ختم کیا، اور سرکاری خزانوں کو عوام پر خرچ کرنے اور رفاہی کاموں کو انجام دینے کی تدبیر کی، اس سلسلہ میں چند نکات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے:

(۱) اب تک عوام پر بہت سارے ٹیکس لگائے جاتے تھے، اور یہ صرف مغل حکمرانوں کا ہی طریقہ نہیں تھا؛ بلکہ اس زمانہ میں جو راجے رجواڑے اور ان کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں، وہ بھی اس طرح کے ٹیکس لیا کرتی تھیں

* جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

شیواجی تو اپنے مقبوضہ علاقہ میں چوتھ یعنی پیداوار کا چوتھائی حصہ وصول کیا کرتے تھے، اورنگ زیب عالمگیرؒ نے مال گذاری کے علاوہ جو ٹیکس لئے جاتے تھے، جن کی تعداد اَسّی (۸۰) ذکر کی گئی ہے، ان سب کو نا منصفانہ اور کسان مخالف قرار دیتے ہوئے ختم کر دیا؛ حالاں کہ اس کی آمدنی کروڑوں ہوتی تھیں، یہ بات قابل غور ہے کہ عام طور پر اورنگ زیبؒ کو ہندو مخالف پیش کیا جاتا ہے؛ لیکن اس نے متعدد ایسے ٹیکسوں کو معاف کر دیا، جن کا تعلق ہندوؤں سے تھا، جیسے گنگا پوجا ٹیکس، گنگا اشنان ٹیکس اور گنگا میں مُردوں کو بہانے کا ٹیکس وغیرہ۔

(۲) اس نے مال گذاری کا قانون مرتب کیا اور اس کے نظم ونسق کو پختہ بنایا، یہاں تک کہ شاہجہاں کے دور میں ڈھائی کروڑ پونڈ کے قریب سلطنت کی آمدنی تھی، تو وہ عالمگیر کے دور میں چار کروڑ پونڈ کے قریب پہنچ گئی

(۳) حکومتوں میں یہ رواج تھا کہ جب کسی عہدہ دار کا انتقال ہو جاتا تو اس کی ساری جائداد ضبط کر لی جاتی اور حکومت کے خزانہ میں داخل ہو جاتی، آج بھی بعض مغربی ملکوں میں ایسا قانون موجود ہے کہ اگر کوئی شخص وصیت کے بغیر دنیا سے گزر جائے تو اس کا پورا ترکہ حکومت کی تحویل میں چلا جاتا ہے، عالمگیر نے اس طریقہ کو ختم کیا؛ تاکہ عہدہ دار کے وارثوں کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔

(۴) اس نے اس بات کی کوشش کی کہ مظلوموں کے لئے انصاف کا حاصل ہونا آسان ہو جائے، وہ روزانہ دو تین بار دربار عام کرتا تھا، یہاں حاضری میں کسی کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں تھی، ہر چھوٹا بڑا، غریب وامیر مسلمان وغیر مسلم، بے تکلف اپنی فریاد پیش کر سکتا تھا اور بلا تاخیر اس کو انصاف فراہم کیا جاتا تھا، وہ اپنے خاندان کے لوگوں، شہزادوں اور مقرب عہدہ داروں کے خلاف فیصلہ کرنے میں بھی کسی تکلف سے کام نہیں لیتا تھا؛ لیکن اس کے علاوہ اس نے دور دراز کے لوگوں کے لئے ۱۰۸۲ھ میں ایک فرمان کے ذریعہ ہر ضلع میں سرکاری نمائندے مقرر کئے کہ اگر لوگوں کو باشاہ اور حکومت کے خلاف کوئی دعویٰ کرنا ہو تو وہ ان کے سامنے پیش کریں اور ان کی تحقیق کے بعد عوام کے حقوق ادا کر دیں۔

(۵) عالمگیر کا ایک بڑا کارنامہ حکومت کی باخبری کے لئے واقعہ نگاری اور پرچہ نویسی کا نظام تھا، جس کے ذریعہ ملک کے کونے کونے سے بادشاہ کے پاس اطلاعات آتی رہتی تھیں، اور حکومت تمام حالات سے باخبر رہ کر مناسب قدم اُٹھاتی تھی، اس نظام کے ذریعہ ملک کا تحفظ بھی ہوتا تھا، عوام کو بروقت مدد بھی پہنچائی جاتی تھی، اور عہدہ داروں کو ان کی غلطیوں پر سرزنش بھی کی جاتی تھی، اس کا سب سے بڑا فائدہ رشوت ستانی کے سدباب کی شکل میں سامنے آیا۔

عام طور پر حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو رشوت ’گفٹ‘ کے نام پر دی جاتی ہے، یہ نام کرپشن کے لئے

ایک پردہ کا کام کرتا تھا، اُس زمانہ میں یہ رقم نذرانہ کے نام سے دی جاتی تھی، جو بادشاہوں کو حکومت کے عہدہ داران اور اصحابِ ثروت کی جانب سے اور عہدہ داروں کو ان کے زیر اثر رعایا کی جانب سے ملا کرتی تھی، اورنگ زیبؒ نے ہر طرح کے نذرانہ پر پابندی لگادی، خاص کر نوروز کے جشن پر تمام امراء بادشاہ کی خدمت میں بڑے بڑے نذرانے پیش کرتے تھے، اورنگ زیبؒ نے اپنی حکومت کے اکیسویں سال اس جشن ہی کو موقوف کردیا اور فرمان جاری کردیا کہ خود اس کو کسی قسم کا نذرانہ پیش نہ کیا جائے۔

(۶) عام طور پر جہاں بھی شخصی حکومتیں رہی ہیں، وہاں عوام کو اطاعت وفرمانبرداری پر قائم رکھنے کے لئے بادشاہ کے بارے میں مبالغہ آمیز تصورات کا اسیر بنایا جاتا ہے، اسی لئے تیمور لنگ کہا کرتا تھا کہ جیسے آسمان پر خدا ہے، زمین میں وہی درجہ ایک بادشاہ کا ہے، اسی لئے مغلوں کے یہاں بھی ہندوانہ طریقہ کے مطابق ایک طرح کی باشاہ پرستی مروج رہی ہے، اکبر کے یہاں تو بادشاہ کا دیدار اور سجدہ کرنا ایک عبادت تھا اور ہر دن بے شمار لوگ یہ عبادت بجالاتے تھے، جہانگیر نے سجدہ ختم کیا؛ لیکن زمین بوسی باقی رہی، عالمگیر نے جھروکا درشن بالکلیہ ختم کردیا، جس میں لوگ صبح کو بطور عبادت بادشاہ کا دیدار کرتے تھے اور اس وقت تک کھاتے پیتے نہیں تھے؛ البتہ اس بات کی اجازت تھی کہ اگر کوئی ضرورت مند آئے تو اس کی درخواست رسی میں باندھ کر اوپر بادشاہ کے پاس پہنچادی جائے۔

(۷) عموماً حکمرانوں کی شاہ خرچی اور حکمرانوں کے چونچلے غریب عوام کی کمر توڑ دیتے ہیں، اورنگ زیب عالمگیرؒ نے ایسے تکلفات کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی، جیسا کہ گذرا، شاہی نذرانوں کو بند کیا، دربارشاہی میں بادشاہوں کی تعریف کرنے والے شعراء ہوا کرتے تھے اور ان پر ایک ذمہ دار ہوا کرتا تھا، جو 'ملک الشعراء' کہلاتا تھا، اورنگ زیبؒ نے اس شعبہ کو ختم کردیا، وہ اپنی شان میں کسی بڑائی اور مبالغہ آمیز شاعری کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے، بادشاہ کا دل بہلانے کے لئے دربارشاہی میں گانے بجانے کا خصوصی انتظام ہوتا تھا، قوال اور رقاصائیں گاکر اور ناچ کر بادشاہ کا دل خوش کرتی تھیں اور ان پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کی جاتی تھیں، عالمگیر نے اس سلسلہ کو بھی موقوف کردیا، بادشاہ کے لکھنے کے لئے سونے اور چاندی کی دواتیں رکھی جاتی تھیں، عالمگیر نے اس کے بجائے چینی کی دواتیں رکھنے کی تلقین کی، انعام کی رقمیں چاندی کے بڑے طشت میں لائی جاتی تھی، اس طشت کی رسم کو بھی اورنگ زیبؒ نے موقوف کردیا، عام طور پر بادشاہوں کی جیب خرچ کے لئے کروڑوں روپے کی آمدنی مخصوص کردی جاتی تھی، آج بھی جمہوری ملکوں میں سربراہ حکومت کے لئے رہائش، سفر اور ضروریات وغیرہ پر جو رقمیں صرف کی جاتی ہیں اور رہائش کے لئے جو وسیع مکان اور اعلیٰ درجہ کی سہولت فراہم کی جاتی ہے، وہ

گذشتہ بادشاہوں کی شاہ خرچی کو بھی شرمندہ کرتی ہیں؛ لیکن اورنگ زیب نے اپنے لئے نہ کوئی عظیم الشان محل تعمیر کرایا، نہ اپنی تفریح کے لئے کوئی باغ بنوایا، اور اپنے مصارف کے لئے بھی محض چندگاؤں کو اپنی حصہ میں رکھا اور بقیہ سارے مصارف کو حکومت کے خزانہ میں شامل کر دیا۔

(۸) اس نے تعلیم کی ترقی پر خصوصی توجہ دی، ہر شہر اور ہر قصبہ میں اساتذہ مقرر ہوئے، نہ صرف اساتذہ کے لئے وظائف مقرر کئے گئے اور جاگیریں دی گئیں؛ بلکہ طلبہ کے اخراجات اور مدد معاش کے لئے بھی حکومت کی طرف سے سہولتیں فراہم کی گئیں، کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیبؒ کے زیادہ تر فرامین تعلیم ہی سے متعلق ہیں، جن کو ان کے بعض تذکرہ نگاروں نے نقل بھی کیا ہے۔

(۹) اُس زمانہ میں صنعت وحرفت کو آج کی طرح ترقی نہیں ہوئی تھی اور معیشت کا سب سے بڑا ذریعہ زراعت تھی، اورنگ زیبؒ نے زرعی ترقی پر خصوصی توجہ دی، کسانوں کی حوصلہ افزائی کی، جن کسانوں کے پاس کاشتکاری کے لئے پیسہ نہیں ہوتا، ان کو سرکاری خزانوں سے پیسے فراہم کئے جاتے، حسبِ ضرورت کسانوں سے مال گذاری معاف کی گئی، جو زمینیں اُفتادہ تھیں اور ان میں کاشت نہیں کی جاتی تھی، ان کو ایسے کسانوں کے حوالہ کیا گیا، جو ان کو آباد کرنے کے لئے آمادہ تھے، اپنے عہدہ داروں کو ہدایت کی کہ کسانوں کو اتنا ہی لگان لگایا جائے، جتنا وہ بآسانی ادا کرسکیں اور بخوشی ادا کرسکیں، اگر وہ نقد کے بجائے جنس دینا چاہیں تو قبول کرلیا جائے، انھوں نے کسانوں کے لئے کنواں کھودوانے، قدیم کنوؤں کو درست کرانے اور آبِ پاشی کے وسائل کو بہتر بنانے کو حکومت کی ایک ذمہ داری قرار دیا، انھوں نے زمین کے سروے کرنے پر خصوصی توجہ کی؛ تاکہ معلوم ہو کہ کونسی اراضی اُفتادہ ہیں اور اُن کو قابل کاشت بنانے کی کیا صورت ہے، انھوں نے اپنے فرمان میں لکھا ہے:

بادشاہ کی سب سے بڑی خواہش اور آرزو یہ ہے کہ زراعت ترقی کرے، اس ملک کی زرعی پیداوار بڑھے، کاشتکار خوشحال ہوں اور عام رعایا کو فراغت نصیب ہو، جو خدا کی طرف سے امانت کے طور پر ایک بادشاہ کو سونپی گئی ہے۔

زرعی پیداوار کی طرف اسی توجہ کا نتیجہ تھا کہ عالمگیرؒ کے دور میں فتح ہونے والے بہت سے علاقے ایسے تھے، جہاں کے اخراجات وہاں کی آمدنی سے زیادہ تھے؛ لیکن پھر بھی کہیں غذائی اشیاء کی قلت محسوس نہیں کی گئی، اگر یہ صورتِ حال نہیں ہوتی تو اتنے طویل وعریض رقبہ پر پچاس سال تک اورنگ زیب حکومت نہیں کر پاتے اور عوام کی بغاوت کے نتیجہ میں مملکت پارہ پارہ ہوجاتی۔

(۱۰) اورنگ زیبؒ کا ایک بڑا کارنامہ سماجی اصلاح بھی ہے، اس نے بھنگ کی کاشت پر پابندی لگائی،

شراب وجوئے کی ممانعت کردی، قحبہ گری کو روکا اور فاحشہ عورتوں کو شادی کرنے پر مجبور کیا، لونڈی، غلام بنا کر رکھنے، یا خواجہ سرا رکھنے پر پابندی لگائی۔

(۱۱) ہندوسماج میں عرصۂ دراز سے ستی کا طریقہ مروج تھا، جس کے تحت شوہر کے مرنے کے بعد بیوی شوہر کی چِتا کے ساتھ نذرِ آتش کردی جاتی تھی، ہندوسماج میں اسے مذہبی عمل سمجھا جاتا تھا، مغلوں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا، غیر مسلموں کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے، اس لئے اورنگ زیبؒ نے قانونی طور پر اس کو بالکلیہ تو منع نہ کیا؛ لیکن اصلاح اور ذہن سازی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے عہدہ داروں کو ہدایت دی کہ وہ عورتوں کو اس رسم سے باز رکھنے کی کوشش کریں اور اپنی خواتین کے ذریعہ بھی ان کو اس کی دعوت دیں، نیز پابندی عائد کردی کہ علاقہ کے صوبہ دار کی اجازت کے بغیر ستی نہ کی جائے؛ تاکہ کسی عورت کو اس عمل پر اس کے میکہ یا سسرال والے، یا سوسائٹی کے دوسرے لوگ مجبور نہ کرسکیں، اس طرح عملاً ستی کا رواج تقریباً ختم ہوگیا۔

غرض کہ اورنگ زیبؒ نے قدیم سڑکوں اور سرایوں کی مرمت، نئی سڑکوں اور مسافر خانوں کی تعمیر، تعلیمی اداروں اور عبادت گاہوں کو جاگیروں کے عطیہ وغیرہ کے جو رفاہی کام کئے، ان کے علاوہ مختلف دوسرے میدانوں میں جو خدمتیں انجام دی ہیں، وہ بھی آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں، اس کی رحم دلی، انصاف پروری اور عفوو درگزر کا ان لوگوں نے بھی اعتراف کیا ہے، جو اس کو ایک خشک مزاج، ناروادار اور سخت گیر حکمراں قرار دیتے ہیں، اس نے ہمیشہ اپنے حریفوں کے ساتھ خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، سنی ہوں یا شیعہ، پٹھان ہوں یا مراٹھے وراجپوت، زیادہ سے زیادہ صلح اور درگزر کی پالیسی اختیار کی، خود شیواجی کو جس طرح انھوں نے بار بار معاف کیا اور اس کے بیٹے کو گلے لگایا، یہ اس کی بہترین مثال ہے، مگر افسوس کہ انگریزوں نے ہندوستان کی دو بڑی قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی دیوار قائم کرنے کی جو منصوبہ بند کوشش کی، اس میں مغلوں کے دورِ حکومت کو عموماً اور آخری پُرشوکت مغل بادشاہ اورنگ زیبؒ (جس کو انگریز اپنے راستہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے) کے بارے میں خصوصاً بڑی غلط فہمیاں پھیلائیں اور بعض مصنفین نے ان کا آلہ کار بنتے ہوئے ایسی کتابیں تصنیف کیں، جن کو تاریخ اور واقعہ نگاری کے بجائے ناول نگاری اور افسانہ نویسی کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا، انھوں نے ایسی بے بنیاد باتیں لکھ دیں جن کا حقیقت اور واقعہ سے کوئی تعلق نہیں، اورنگ زیبؒ کو ایک ہندو دشمن حکمراں کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور اس کے لئے اورنگ زیبؒ اور شیواجی کی جنگ کو بنیاد بنایا گیا؛ حالاں کہ یہ ایک سیاسی جنگ تھی نہ کہ مذہبی، اورنگ زیبؒ اور شیواجی کی جنگ میں اورنگ زیبؒ کا سب سے معتمد کمانڈر ایک راجپوت راجہ جے سنگھ تھا، اس کے علاوہ رائے سنگھ، راجہ سجان سنگھ،

کیرت سنگھ، مترسین، اندرامن بندیلہ، راجہ نرسنگھ گوڑ، جگت سنگھ، سترسنگھ اور راج سنگھ، چتر بھوج چوہان اور بے شمار راجپوت اور مراٹھے سردار اورنگ زیبؒ کے ساتھ تھے اور اس کی فوج میں بھی بڑی تعداد پٹھانوں، راجپوتوں اور شیواجی کے مخالف مراٹھوں کی تھیں۔

اورنگ زیبؒ کے عہد میں جو غیر مسلم حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر رہے ہیں، ان میں کئی مرہٹے ہیں، جن میں شیواجی کے داماد اور بھتیجے بھی شامل ہیں، علامہ شبلیؒ نے ان کا نام بہ نام ذکر کیا ہے، جن کی تعداد ۲۶ ہے، خود شیواجی کو بھی اورنگ زیبؒ نے پنج ہزاری منصب عطا کیا تھا، جو بڑا منصب تھا، اور جس پر بادشاہ کے بعض شہزادے، قریبی رشتہ دار اور معتمد عہدہ دار فائز تھے؛ البتہ شیواجی ہفت ہزاری چاہتے تھے، مگر راجپوت اور پٹھان اعیانِ حکومت اس کے حق میں نہیں تھے۔

دوسری طرف شیواجی کے تعلقات بیجاپور اور جنوبی ہند کی مختلف چھوٹی چھوٹی مسلم حکومتوں کے حکمرانوں سے تھے اور ان ہی کی در پردہ یا علانیہ تائید وتقویت سے وہ مغلوں پر حملہ کرتے تھے، خود اورنگ زیبؒ کو دیکھئے کہ اس نے اپنے بھائیوں سے بھی جنگ کی، گولکنڈہ کی قطب شاہی مسلم حکومت پر بھی قبضہ کیا، بیجاپور کی مسلمان سلطنت کو بھی اپنی مملکت کا حصہ بنایا اور کتنے چھوٹے بڑے مسلم حکمرانوں کے ساتھ جنگ کرنے کی نوبت آئی، نیز خود شیواجی کی فوج میں کثیر تعداد میں مسلمان فوجی شامل رہے، خاص کر جب اورنگ زیبؒ نے دکن میں اپنی فوج میں کسی قدر تخفیف کی تو یہ فوج بھی ٹوٹ کر شیواجی کے ساتھ جا ملی۔

تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ شیواجی جو مغلوں کے خلاف گوریلا جنگ لڑا کرتے تھے، وہ گاؤں کے گاؤں لوٹ لیا کرتے تھے، قلعوں کو تاخت وتاراج کر دیا کرتے تھے، یہ لوٹ مار ان کی مستقل حکمت عملی تھی، اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کوئی تفریق نہیں ہوا کرتی تھی، سورت اس زمانہ میں جنوبی ہند کی سب سے بڑی منڈی تھی، جو بیرونی ممالک سے درآمد و برآمد کا بہت بڑا ذریعہ تھی، یہاں غالب آبادی ہندوؤں کی تھی، شیواجی موقع بموقع وہاں ایسا حملہ کرتے تھے کہ پورا شہر ویران ہو جاتا تھا، کیا ہندو کیا مسلمان اور کیا ملکی اور کیا غیر ملکی، سب کے سب ان حملوں سے پناہ چاہتے تھے، ان حملوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کوئی تفریق نہیں تھی؛ بلکہ تاجروں کی غالب تعداد ہندوؤں کی تھی، اس لئے ان کو زیادہ نقصان اُٹھانا پڑتا تھا، یہاں تک کہ شیواجی جن کو مراٹھوں کا نجات دہندہ سمجھا جاتا ہے، خود مراٹھوں کے خلاف بھی انھوں نے وہی کیا، جو ہر بادشاہ اپنے اقتدار کی حفاظت کے لئے کیا کرتا ہے، بیجاپور کے پہلے سلطان نے ایک مراٹھے خاندان کو'جاولی' کا علاقہ عطا کیا، جس نے ایک مضبوط ریاست بنائی اور یہ بتدریج کوکن کے پورے علاقہ پر قابض ہو گیا، اس خاندان کے راجا کا خاندانی

لقب چندر راؤ تھا، شیواجی کا احساس تھا کہ جب تک چندر راؤ کا قتل نہ کیا جائے اور اس کی سلطنت پر قبضہ نہ ہوجائے، شیواجی جس وسیع سلطنت کا منصوبہ رکھتے ہیں، وہ شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا، اس لئے اس نے دھوکہ دے کر اس مرہٹہ راجا کو قتل کیا، اس کے بھائی کو زخمی کیا اور اس کی سلطنت پر قابض ہوگئے، غرض کہ اورنگ زیبؒ اور شیواجی کی جنگ کوئی مذہبی جنگ نہیں تھی؛ بلکہ ایک سیاسی جنگ تھی، جو حکمرانوں کے درمیان ہمیشہ ہوتی رہی ہے، نہ اورنگ زیب نے اسلامی نقطۂ نظر سے یہ جنگ لڑی ہے اور نہ شیواجی کا حملہ ہندوؤں کے وقار کی حفاظت کے لئے ہوا ہے۔

اورنگ زیبؒ پر ایک الزام لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو منہدم کیا ہے اور مندر شکنی کے مرتکب ہوئے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اورنگ زیبؒ کے عہد میں بعض مندر منہدم کئے گئے ہیں؛ لیکن اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ اس کا سبب کیا تھا؟ غیر جانبدار مؤرخین نے لکھا ہے کہ اورنگ زیبؒ نے انھیں مندروں کو منہدم کیا تھا، جو غیر قانونی طور پر بنائے گئے تھے، مثلاً اورچھا میں ببر سنگھ دیو کے بنائے ہوئے ایک مندر کو اورنگ زیبؒ نے منہدم کرا دیا؛ لیکن اس لئے کہ ببر سنگھ دیو نے اولاً تو ظالمانہ طور پر ابوالفضل کو قتل کیا اور پھر اسی کے سرمایہ سے وہ مندر بنایا، یہی وجہ ہے کہ جب وہ مندر منہدم کیا گیا تو وہاں کے راجہ دیوی سنگھ نے کوئی اعتراض نہیں کیا، یا اس نے ایسے مندروں کو گرایا، جہاں حکومتوں کے خلاف سازشیں کی جاتی تھیں، یا ایسے مندروں کو جہاں غیر اخلاقی حرکتیں کی جاتی تھیں، جیسے بنارس کا وشوناتھ مندر، ڈاکٹر بی، ایم، پانڈے نے اس کی تاریخ اس طرح بیان کی ہے کہ اورنگ زیبؒ جب بنگال جاتے ہوئے بنارس کے قریب سے گذرے تو اس کی فوج میں شامل ہندو راجاؤں اور کمانڈروں نے وہاں ایک دن قیام کی درخواست کی؛ تاکہ ان کی رانیاں گنگا اشنان کر سکیں اور وشوناتھ دیوتا کی پوجا کریں، اورنگ زیبؒ راضی ہوگئے، انھوں نے فوج کے ذریعہ حفاظت کا پورا انتظام کیا، رانیاں اشنان سے فارغ ہوکر وشوناتھ مندر روانہ ہوئیں؛ لیکن جب مندروں سے رانیاں واپس ہوئیں تو اس میں بعض موجود نہیں تھیں، کافی تلاش کی گئی، مگر پتہ نہیں چل سکا، بالآخر تحقیق کاروں نے دیوار میں نصب گنیش کی مورتی کو ہلایا، جو اپنی جگہ سے ہلائی جاسکتی تھی تو نیچے سیڑھیاں نظر آئیں، یہ سیڑھیاں ایک تہہ خانہ کی طرف جاتی تھیں، وہاں انھوں نے دیکھا کہ بعض رانیوں کی عصمت ریزی کی جاچکی ہے اور وہ زار و قطار رو رہی ہیں؛ چنانچہ اورنگ زیبؒ کی فوج میں شامل راجپوت کمانڈروں نے اس مندر کو منہدم کر دینے کا مطالبہ کیا، اورنگ زیبؒ نے حکم دیا کہ مورتی کو پورے احترام کے ساتھ دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے اور چوں کہ ایک مقدس مذہبی مقام کو ناپاک کیا گیا ہے؛ اس لئے اس کو منہدم کر دیا جائے اور مہنت کو گرفتار کر کے سزا دی جائے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ اکبر کے دور سے صورتِ حال یہ تھی کہ بہت سی مسجدوں کو منہدم کر کے بُت خانے بنا دیئے جاتے تھے، ہندو مسلمان عورتوں سے جبراً نکاح کرتے تھے اور انھیں اپنے تصرف میں لاتے تھے، جہانگیر اور شاہجہاں کے دور میں بھی یہی صورتِ حال باقی رہی، اور خود اورنگ زیبؒ کی حکومت کے بارہویں سال تک یہی صورت حال تھی، ممکن ہے کہ بعض مندروں کے انہدام کا یہی پس منظر ہو، اگر واقعی اورنگ زیبؒ مندر شکن اور بُت شکن ہوتا تو اس کی وسیع سلطنت میں کتنے ہی قدیم اور بڑے بڑے مندر موجود تھے، جو آج بھی برادرانِ وطن کی عقیدت کا مرکز ہیں، کیا آج ان کا وجود ہوتا؟ لیکن بہر حال مذہبی عبادت گاہوں کا انہدام ایک غلطی اور ایک غیر اسلامی فعل ہے؛ لیکن یہ مذہبی جذبہ کے تحت کیا جانے والا عمل نہیں ہے؛ چنانچہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اورنگ زیبؒ نے جہاں مندر منہدم کئے ہیں، وہیں مسجد بھی منہدم کروائی ہے، کہا جاتا ہے کہ سلطنت گولکنڈہ کے مشہور فرمانروا تانا شاہ نے سالہا سال سے شہنشاہ دہلی کو شاہی محصول ادا نہیں کیا تھا، اس نے اپنی دولت کو چھپانے کے لئے ایک بڑا خزانہ زیر زمین دفن کر کے اس پر جامع مسجد گولکنڈہ تعمیر کرادی، اورنگ زیبؒ کو کسی طرح اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس مسجد کو منہدم کرادیا، اور اس خزانہ کو رفاہ عام کے کاموں میں صرف کر دیا۔

افسوس کہ فرقہ پرست، متعصب اور دروغ گو تذکرہ نگاروں نے اورنگ زیبؒ کی اس سخاوت اور وسیع النظری کا تذکرہ نہیں کیا، جو اس کا اصل مزاج تھا، اس نے مندروں کے ساتھ جس فراخدلی کا ثبوت دیا، اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا جاتا، اس سلسلہ میں ڈاکٹر بی، ایم، پانڈے نے چند مندروں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، جیسے گوہاٹی کا مندر، جب اورنگ زیبؒ نے آسام کے علاقہ پر قبضہ کیا تو اس نے نہ صرف اس مندر کی جاگیر کو باقی رکھا؛ بلکہ حکم جاری کیا کہ یہ ہمیشہ کے لئے پجاری کا حق ہے؛ تاکہ اس کی آمدنی وہ اپنے دیوتاؤں کے بھوگ کے لئے استعمال کر سکیں اور منہمک ہو کر عبادت کریں اور یہ بھی حکم جاری کیا کہ اس پر کوئی مال گذاری نہیں لی جائے۔

اُجین میں مہا کالیشور مندر واقع ہے، جس میں چوبیس گھنٹے چراغ روشن رہتا ہے، جس کو 'نندا دیپ' کہتے ہیں، اس چراغ کو روشن رکھنے کے لئے راجاؤں کے عہد میں چار سیر گھی دیا جاتا تھا، مغلوں اور خود اورنگ زیبؒ کے دور میں بھی ٹھیک اسی طرح اس کو باقی رکھا گیا، اورنگ زیبؒ نے احمد آباد میں ناگر سیٹھ کو شترنجے اور آبو کی مندروں کی تعمیر کے لئے وسیع اراضی عطا کیں اور اس کے لئے سند بھی جاری کی، ڈاکٹر، بی، ایم، پانڈے نے اپنی کتاب ''ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین'' میں اورنگ زیبؒ کے چھ فرامین کی فوٹو کاپی اور فارسی متن کے ساتھ ان کا ترجمہ نقل کیا ہے، یہ سب فرامین مندروں، ان کے پجاریوں اور مذہبی پیشواؤں کی جاگیروں کے

سلسلہ میں ہیں، یہ کس قدر ناانصافی کی بات ہے کہ ایسے بادشاہ کے بارے میں آج بالکل یکطرفہ بیانات دیئے جارہے ہیں۔

کاش فرقہ پرست عناصر کبھی اس بات پر بھی غور کرتے کہ خود ہندوؤں نے کس طرح بودھوں کی خانقاہوں، جینوں کے مندروں اور مسلمانوں کی مسجدوں کو منہدم کیا ہے، خود شیواجی نے ستارہ، پارلی، اور زیر قبضہ آنے والے علاقوں میں مسجدوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی، ایلورا اور اجنتا میں بودھوں کو یہ کیوں کرنا پڑا کہ اپنی عظیم الشان خانقاہوں کو مٹی سے ڈھانپ دیں؛ تاکہ وہ ہندوؤں کی دست برد سے محفوظ رہ سکیں، آج بھی جگن ناتھ مندر ہندوؤں کی زیادتی کی گواہ بن کر کھڑا ہے، جو دراصل بودھوں کا مندر تھا، اور جس پر زبردستی ہندوؤں نے قبضہ کرلیا، ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں ہزاروں مسجدیں شہید کردی گئیں، اندرا جی کے دور میں سکھوں کی سب سے مقدس عبادت گاہ گولڈن ٹمپل اور اکال تخت کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، گجرات کے ۲۰۰۲ء کے فساد میں کتنی ہی مسجدیں شہید کردی گئیں اور حکومت نے اس کی تعمیر نو کرنے سے انکار کردیا، کیا فرقہ پرست عناصر سچائی کی نشاندھی کرنے والے اس آئینہ میں بھی اپنا چہرہ دیکھنا گوارہ کریں گے؟

اورنگ زیبؒ کے فرد جرم میں اس بات کو بھی شامل کیا گیا ہے کہ اس نے ہندوؤں پر جزیہ لگادیا تھا؛ لیکن اس بات پر غور نہیں کیا گیا کہ اس نے ۸۰ قسم کے ٹیکس معاف کردیئے، جن میں کئی ٹیکسوں کا تعلق ہندوؤں سے تھا اور جزیہ ان پر اس لئے عائد کیا گیا کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ لی جاتی تھی، اگر ہندوؤں سے بھی زکوٰۃ لی جاتی تو یہ ان کو ایک اسلامی عمل پر مجبور کرنا ہوتا، اور مذہبی آزادی کے تقاضے کے خلاف ہوتا، اس لئے اسلام نے غیر مسلم شہریوں پر الگ نام سے یہ ٹیکس مقرر کیا ہے اور اس کی مقدار نہایت قلیل ہے: فی کس بارہ درہم یعنی ۱۳ ؍تولہ چاندی سے بھی کم، پھر شریعت کے حکم کے مطابق اورنگ زیبؒ نے عورتوں، بچوں، مذہبی پیشواؤں، معذروں اور غریبوں کو اس سے مستثنیٰ رکھا اور جزیہ کے بدلہ غیر مسلم عوام کے تحفظ کی گارنٹی دی گئی۔

ان سب کے باوجود ہمیں یہ حقیقت ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اورنگ زیبؒ کوئی عالم، مفتی اور صوفی نہ تھا ایک سیاسی قائد اور حکمراں تھا، بھائیوں کا قتل ہو یا بعض سکھ رہنماؤں کا، مندروں کا انہدام ہو یا مسجدوں کا، یہ سیاسی مقاصد کے تحت تھے، یہ غلط ہو سکتے ہیں؛ لیکن اس کو مذہب کی جنگ قرار دینا اس سے زیادہ غلط ہے، اورنگ زیبؒ سے متعلق میڈیا میں جو بحث جاری ہے، وہ علم وتحقیق کے بجائے غلط فہمی اور جذباتیت پر مبنی ہے، جو لوگ اس معاملہ کی سچائی کو جاننا چاہیں اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنا چاہیں، انھیں علامہ شبلی نعمانی کی ''اورنگ زیب عالمگیرؒ پر ایک نظر''، سید صباح الدین عبدالرحمن کی ''مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری'' (جلد سوم)، مولوی

ذکاء اللہ کی ''اورنگ زیب عالمگیرؒ''، مولانا نجیب اشرف ندوی کی ''مقدمہ رقعات عالمگیر'' اور ڈاکٹر، بی، ایم، پانڈے کی ''ہندو مندر اور اورنگ زیب عالمگیر کے فرامین'' کا مطالعہ کرنا چاہیئے؛ لیکن اس وقت ایک بڑا کام یہ ہے کہ کچھ حقیقت پسند، غیر جانبدار، انصاف پسند ہندو اور مسلمان اٹھیں اور سندھ میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر برطانیہ سے ہندوستان کی آزادی تک کی تاریخ اس طور پر لکھیں، جو فرقہ وارانہ تاثرات سے خالی ہو، جس میں ہر طبقہ کی خدمات کا اعتراف کیا جائے، جس میں بادشاہوں اور راجاؤں کی جنگ کو ایک سیاسی جنگ کی نظر سے دیکھا جائے نہ کہ مذہبی جنگ کی حیثیت سے، جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان باہمی رواداری اور اُخوت و بھائی چارہ کو نمایاں کیا جائے، جو محبت کی خوشبو بکھیرے نہ کہ نفرت کا تعفن، یہ ایک ضروری کام ہے، جس کی طرف تحقیقاتی اکیڈمیوں، تعلیمی اداروں، ملی تنظیموں، قومی اداروں اور باصلاحیت اور منصف مزاج دانشوروں کو توجہ دینی چاہئے، جیسے ہمارے ہندو بھائیوں کے مذہبی ماخذ میں کوروؤں اور پانڈوؤں کی تباہ کن جنگوں کا ذکر موجود ہے، یا 'منوسمرتی' میں شودروں کے خلاف تحقیر و تذلیل کا واضح اور بھرپور تذکرہ ہے؛ لیکن ان کو نفرت کی تبلیغ کا ذریعہ نہیں بنایا گیا، اسی طرح ہم ہندو و مسلم حکمرانوں کی آپسی لڑائیوں کو بھی نفرت کی اشاعت کا ذریعہ نہ بنائیں۔

(بقیہ صفحہ: ۴۸ سے)

گذشتہ سال کے اختتام پر حضرت ناظم صاحبؒ نے ''تخصص فی اللسانین'' کے نام سے ایک نئے شعبہ کے قیام کا اعلان فرمایا تھا، جس میں عربی اور انگریزی زبانوں پر محنت کروا کر دعوتِ دین کے مختلف میدانوں میں کام کے قابل افراد کو تیار کرنا مقصود ہے، اس شعبہ میں ۶ ؍طلبہ ہیں۔

پنج سالہ عالمیت:۔ بڑی عمر کے طلباء کے لئے پانچ سالہ مختصر مدتی عالمیت کا جامع و مفید نصاب و نظام کے ساتھ اسی سال سے آغاز کیا گیا، جس میں ۳۵ ؍طلباء زیر تعلیم ہیں، اور اُن کی علمی خدمت کے لئے ۶ ؍اساتذۂ کرام مصروفِ تدریس ہیں۔

معہد الاشرف: حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی گرامی قدر شخصیت سے منسوب ہے، اس شعبہ میں دینی وعصری علوم کا نظم ہے، ''SSC'' کامیاب طلباء کو اس شعبہ میں داخلہ دیا جاتا ہے، جو پانچ سالہ عالمیت کے ساتھ انٹر اور ڈگری کی تعلیم مکمل کر کے کسی بڑے ادارہ سے دورۂ حدیث شریف کی تکمیل کرتے ہیں، اس شعبہ میں ۶۶ ؍طلباء زیر تعلیم ہیں، جن کی بہتر تعلیم و تربیت کے لئے ۹ ؍اساتذہ مصروف کار ہیں

مطالعہ کی میز پر

دو کتابیں۔۔۔۔دو مثالیں

از: مولانا محمد انصار اللہ قاسمی*

مخدوم گرامی حضرت مولانا محمد عبد القوی صاحب دامت برکاتہم ممتاز اور مایہ ناز علماء دین میں سے ہیں اور اپنی بلند پایہ ہمہ جہت اور ہشت پہلو علمی فکری تعلیمی اور دعوتی خدمات کی وجہ سے وقت کے نامور وقدآور علماء میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، آپ کی تحریروں اور تقریروں میں درد دِل دوائے دل اور سوزِ دل تینوں باتیں بیک وقت محسوس کی جاتی ہیں۔

" بھٹکے ہوئے آہوں کو پھر سوئے حرم لے چلنا" یہ مولانا محترم کی خدمات کا ایک اہم اور خاص عنوان ہے بالخصوص جن بھائیوں نے اسلام کے نام پر کفریہ عقائد کو قبول کیا ہے اور ہدایت کے نام پر گمراہی کے راستہ کو اختیار کیا ہے اُن تک پوری ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ حق بات پہونچانا اور سمجھانا یہ آپ کا جذبہ دروں ہے اس سلسلہ میں آپ کی دو کتابیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، ایک " مطالعہ مہدویت" اور دوسری کتاب " صدیق دیندار چن بسویشورا اپنی تحریرات کے آئینہ میں" ہے

" مطالعہ مہدویت" کتاب کے بارے میں یہ کہنا تو درست نہیں ہوگا کہ اس کی وجہ سے مہدوی فرقہ میں" زلزلہ اور بھونچال" آگیا کیوں کہ یہ کتاب اس مقصد سے لکھی ہی نہیں گئی تھی، کتاب کا مقصد مثبت اور معروضی انداز میں بغیر کسی طنز وتعریض کے دعوتی اسلوب میں مہدوی فرقہ کے اصل عقیدوں کو پیش کرنا تھا اور مہدوی حضرات کو منصفانہ غور وفکر کی دعوت دینا تھا، الحمدللہ مہدوی عقائد کی اصلیت سامنے آنے کے بعد بہت سے منصف مزاج اور حقیقت پسند مہدوی حضرات کو احساس ہوا کہ صحیح منزل کو پانے اور اس تک پہنچنے کے شوق وجذبہ میں کہیں ہم غلط راستے پر تو نہیں چل پڑے؟؟ چنانچہ مہدوی فرقہ کی بڑی تعداد اپنے غلط وگمراہ عقائد سے تائب ہوئی اور مہدویت کے اسلام مخالف تصور ونظریہ کو چھوڑ کر قبولِ حق کی سعادت سے مشرف ہوئی اس طرح مولانا محترم کی یہ کتاب مہدوی حضرات کے لیے اصلاح وہدایت کی نقیب ثابت ہوئی۔

---

* آرگنائزر مجلس تحفظ ختم نبوت ٹرسٹ تلنگانہ وآندھرا پردیش

دوسری کتاب دیندار انجمن سے وابستہ افراد کی اصلاح وہدایت کے لئے لکھی گئی، اس میں بھی انجمن کے بانی وپیشوا کی تحریروں کی روشنی میں نہایت ہی گمراہ کن ملحدانہ اور کافرانہ افکار ونظریات کی وضاحت کی گئی ۔۔۔۔۔۔مگر اس کتاب کی اشاعت کے بعد دیندار انجمن کے لوگوں میں وہ تبدیلی نظر نہیں آئی جو" مطالعہ مہدویت" کی اشاعت کے بعد مہدوی فرقہ میں نظر آئی اور نہ ہی مہدوی حضرات کی طرح ان لوگوں میں قبول حق کا امید افزا ردعمل دیکھنے کو ملا۔

قبولِ حق کے حوالہ سے دونوں کے ردعمل میں یہ فرق کیوں ہے؟ حالاں کہ دونوں کتابیں ایک ہی مقصد اور ایک ہی جذبہ کے تحت لکھی گئیں۔

دیندار انجمن اور مہدوی فرقہ کے حالات اور ماحول پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دیندار انجمن کی بہ نسبت مہدوی فرقہ میں تعلیم یافتہ افراد زیادہ ہیں ظاہر ہے کہ آدمی جب تعلیم یافتہ ہوتو وہ کچھ سنجیدہ اور باشعور بھی ہوتا ہے، اس میں صحیح اور غلط کو سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس لئے مہدوی فرقہ میں جب حق بات پوری سچائی اور ثبوتوں کے ساتھ سامنے آئی تو ان تعلیم یافتہ حضرات کو حق سمجھنے اور قبول کرنے میں دیر نہیں لگی، اس کے علاوہ مہدوی فرقہ میں مالدار اور خوشحال طبقہ بھی اچھا خاصا ہے، مالدار آدمی میں اگر مال ودولت کا غرور وتکبر نہ ہو اور اس میں قبولِ حق کا مادہ اور حوصلہ ہوتو وہ کسی نام نہاد پیر ومرشد کی ذہنی وفکری غلامی میں زیادہ دن نہیں رہ سکتا۔

مشکل یہ ہے کہ دیندار انجمن کے لوگوں یہ دونوں باتیں نہیں ہے، جہالت کی وجہ سے وہ بہت ہی ضدی اور ہٹ دھرم واقع ہوئے، اس بناء پر وہ اپنے گمراہ اور گستاخانہ عقیدوں پر اڑے رہے، ان میں تلاشِ حق کا جذبہ اور قبولِ حق کا حوصلہ پیدا نہیں ہوسکا

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق وعنایت کے بعد قبولِ حق کے لئے آدمی کا تعلیم یافتہ، سنجیدہ اور باشعور ہونے کے ساتھ اس میں تلاشِ حق کا جذبہ اور قبولِ حق کا حوصلہ ہونا خاص اہمیت رکھتا ہے۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ

احوالِ جامعہ

جامعہ کے شب روز

از: مفتی محمد احمد علی قاسمی*

ادارہ اشرف العلوم جنوبی ہند کی ممتاز و بافیض درسگاہ ہے، جو اپنے تعلیمی وتربیتی اعلیٰ نظام کے حوالہ سے الحمدللہ امتیازی شہرت کا حامل ہے، ادارۂ ہذا کا تعلیمی سال اور مدارس کی طرح ماہِ شوال سے شروع ہوتا ہے۔

امسال نئے تعلیمی سال کے آغاز اوراس کے نظام العمل کا اعلان رمضان المبارک ہی میں کردیا گیا تھا، چنانچہ حسب اعلان ۱۲؍تا۱۶؍شوال ۴۳ھ جدید وقدیم طلباء نے داخلوں کی کاروائی مکمل کی، ۱۶؍شوال کو حضرت اقدس ناظم صاحب مدظلہ العالی نے تمام طلبہ واساتذہ کرام سے علمِ دین کی اہمیت وفضیلت کے عنوان سے بصیرت افروز خطاب فرمایا، ۱۷؍شوال المکرم تک تمام درجات کی ترتیب دے دی گئی، ۱۹؍شوال المکرم بروز شنبہ حضرت ناظم صاحب مدظلہ العالی نے تمام اساتذۂ کرام سے تدریس ونظامِ تعلیم کے متعلق بات فرمائی، اور تمام شعبۂ جات میں تعلیم کا آغاز ہوگیا، قدیم وجدید طلبہ جو امسال مختلف شعبہ جات سے وابستہ ہوئے ان کی تفصیل اس طرح ہے؛

شعبہ معہد الابرار:۔ محی السنۃ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحبؒ کے نام نامی سے منسوب اس شعبہ میں قرآن مجید کی باتجوید تعلیم کا نظم ہے، اس سال شعبۂ حفظ وناظرہ میں ۷ ۵۳ طلباء ہیں، جو ۳۳؍مجود اساتذہ کی نگرانی میں اپنے تعلیمی سفر کا آغاز کرچکے ہیں، اس سال ناظرہ کے طلباء جدید نصاب تعلیم کے مطابق ناظرہ قرآن کے ساتھ ساتھ عصری علوم بھی حاصل کریں گے۔

شعبۂ معہد الاقاسم:۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کے نام سے موسوم اس شعبہ میں اعدادیہ تا دورۂ حدیث کی تعلیم کا انتظام ہے، تمام درجات میں اس سال ۱۶ ۴ طلباء ہیں، جن کی تعلیمی وتربیتی سرگرمیاں ۳۳؍قابل وفعال اساتذہ کرام کے سپرد ہیں، ادارہ ہذا میں شعبہ افتاء کئی برسوں سے قائم ہے، اس سال داخلہ امتحان کے بعد ۱۱؍طلبۂ کرام کا انتخاب عمل میں آیا۔ (بقیہ صفحہ: ۴۵ پر)

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

فقہ وفتاویٰ

آپ کے شرعی مسائل

از: مفتی ندیم الدین قاسمی*

سودی رقم سے بنائے گئے گھر میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال: سودی رقم سے بنائے گئے گھر میں نماز پڑھنے سے نماز ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟

جواب: سود پر قرض لے کر بنائے ہوئے مکان میں نماز پڑھنے سے نماز ادا تو ہو جائے گی؛ البتہ شک وشبہ سے خالی جگہ ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ (مستفاد از: فتاوی رحیمیہ، ۶/ ۲۳)

تمباکو کی خرید وفروخت کا حکم

سوال: تمباکو کی خرید فروخت اور اس کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس سے حاصل شدہ آمدنی کا کیا حکم ہے؟

جواب. تمباکو کی خرید وفروخت اور اس کا استعمال حرام تو نہیں ہے؛ مگر مکروہ ہے، اور جو آمدنی اِس ذریعہ سے حاصل ہو وہ بھی حرام نہیں ہے۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند ۱٤/ ۳٦٥)

سیلاب میں بہہ کر آئی ہوئی چیزوں کا حکم

سوال: سیلاب کے پانی میں سامان، کرسی، برتن وغیرہ چیزیں بہہ کر آ جائے، تو کیا ان کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

جواب: سیلاب میں جو چیزیں بہہ کر آتی ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں (۱) معمولی چیزیں جن کی اہمیت نہ ہو، جن کی تلاش کی کوشش نہ کی جاتی ہو۔ (۲) قیمتی چیزیں جن کو مالک تلاش کرے۔ اگر پہلی قسم کی چیزیں ملیں تو ان کی تشہیر اور اعلان کی ضرورت نہیں، وہ استعمال کر سکتے ہیں؛ لیکن مالک آ کر طلب کرے تو دینا ضروری ہوگا۔ دوسری قسم کی چیزیں ملیں تو ان کی تشہیر اور اعلان ضروری ہے، ان کے لئے مالک کا انتظار کیا جائے گا، اگر مالک آنے کی توقع نہ ہو یا ان کے خراب ہو جانے کا خطرہ ہو تو غریب کو دی جا سکتی ہیں، اگر خود حاجت مند ہو تو استعمال

---

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

بھی کر سکتا ہے؛ لیکن اگر مالک آ کر طلب کرے تو دینا ضروری ہوگا، غریب کو دی ہو تو اس سے واپس لی جائے ، اگر وہ چیز موجود نہ ہو تو اس کی قیمت دینا ضروری ہوگا۔ (فتاویٰ رحیمیہ، ۹/ ۱۹۴)

والدین اور اساتذہ کی تعظیم میں کھڑا ہونا

سوال: والدین یا اساتذہ کے لئے تعظیماً کھڑا ہونا شرعا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: والدین، اساتذہ، اہل علم یا دوسرے قابلِ تعظیم افراد کے لئے بہ غرضِ تعظیم کھڑا ہونا جائز ہے؛ بلکہ فقہاء نے اسے مستحب لکھا ہے۔ (فتاویٰ عثمانی، ۱/ ۲۹۵)

دیر سے آنے والے طلباء سے جرمانہ لینے کا حکم

سوال: میرا سوال یہ ہے کہ میں ایک پرائیویٹ اسکول ٹیچر ہوں اور طلباء روزانہ کی بنیاد پر لیٹ اسکول آتے ہیں، ہم نے طلباء کو سمجھایا؛ لیکن وہ اس کے باوجود دیر سے اسکول آتے ہیں، ہم نے ان پر جرمانہ فیس لگایا ہے۔ دلائل کی روشنی میں جواب دیں کہ جرمانہ لگانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: صورت مسئولہ میں اسکول انتظامیہ کا دیر سے آنے والے بچوں پر مالی جرمانہ لگانا جائز نہیں ہے، اسکول انتظامیہ کو چاہیے کہ وہ طلباء کی بروقت حاضری کو یقینی بنانے کے لیے جرمانہ فیس کے بجائے کوئی اور جائز اور مناسب سزا تجویز کریں؛ مثلاً دیر سے آنے والے طلباء کی سرزنش کرنا، یا ان کے والدین/ سرپرست کو بلا کر انہیں بروقت طالب علم کے آنے کی تاکید کرنا وغیرہ۔ (شامی، ۶/ ۱۰۶)

مسلمانوں کا مندر تعمیر ہونے کی دعوت میں شرکت کرنا

سوال: ہمارے یہاں غیر مسلموں نے مندر تعمیر کیا ہے اور اس میں وہ لوگ دعوتِ طعام کر رہے ہیں، اس میں مسلمانوں کو بھی مدعو کیا ہے، تو کیا مسلمان ان کے ساتھ وہاں جا کر کھانا کھا سکتے ہیں؟ اس لئے کہ عام طور پر خوشی کے موقع پر دونوں طرف کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہیں اور جاتے ہیں۔

جواب: وہ مقامات جہاں غیر اللہ کی عبادت کی جاتی ہے، یا کفار اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرتے ہیں، چوں کہ یہ مقامات معصیت کا گڑھ اور شیطان کی آماج گاہ ہوتے ہیں، اس وجہ سے ان مقامات پر جانے کی شرعاً اجازت نہیں، ہاں! اگر جانے کا مقصد ان کو دینِ اسلام سے قریب کرنا ہو تو ان سے ملاقات کی کوئی اور شکل بنائی جائے جو شرعا جائز ہو۔ (البحر الرائق: ۷/ ۲۱۴)